ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

جنوری ۲۰۲۲ء — جلد نمبر ۱۳ — شمارہ نمبر ۷ — جمادی الاولی ۱۴۴۳ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس ادارت

- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- مولانا مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- مولانا محمد قمر الزماں ندوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد انصاری 9808850029

محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

خط و کتابت کا پتہ:

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر ڈی، کوارسی بائی پاس، علی گڑھ

e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00روپے
سالانہ:	250:00روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ:	500:00روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال):	4000:00روپے

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

Designed and composed by, MD Hifzur Rahman Nadwi , Mob No 9528097025

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	فواحش کو فروغ دینا سنگین جرم ہے	محمد عارف ندوی	
۲۔	اداریہ	پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا	مدیر	۳
۳۔	فکر ونظر	مساجد میں خواتین کی آمد ایک تاریخی وفقہی مطالعہ	مولانا الیاس نعمانی، لکھنؤ	۹
۴۔	تحقیق وتنقید	اہلِ کتاب اور مسئلہ کفر وایمان	مولانا محمد غزالی ندویؒ	۲۲
۵۔	تجزیہ	دعوتِ دین میں درپیش چیلنجز اور علما کی ذمہ داریاں	ڈاکٹر اکرم ورک پاکستان	۲۷
۶۔	اصلاح وتذکیر	اپنی اصلاح کے ساتھ گھر والوں کی اصلاح.....	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	۴۲
۷۔	سوانحی مطالعہ	آپ بیتی شیخ تقی الدین ہلالی مراکشیؒ	طلحہ نعمت ندوی	۴۸
۸۔	مطالعۂ تاریخ	ہند میں اسلام کی آمد	محمد عرفان	۵۶
۹۔	فلکیات	شہاب ثاقب	ڈاکٹر محمد انس ندوی	۶۰
۱۰۔	علم وتحقیق	سیرت طیبہ کے مشہور من گھڑت واقعات	محمد سہیل ندوی	۶۳
	شعروادب	محبت صلح بھی پیکار بھی ہے	جگر مرادآبادی	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

جی ہاں! سرزمین حرم پر اغیار کی حکمرانی مکمل ہوچکی ہے، اغیار کی تہذیب، اغیار کا تمدن اور اغیار کے افکار کا تسلط ہو چکا ہے، کیا اب بھی کسی کو ولی عہد کے ''معتدل اسلام'' کا مفہوم ومطلب سمجھنے میں کوئی دشواری پیش آرہی ہے، اب تو سب کچھ جگ ظاہر ہو چکا، اب تو جس کلچر کو وہاں فروغ دیا جارہا ہے، ڈر ہے کہ کہیں حج وعمرہ بھی اسی کلچر کے زیر سایہ نہ ادا کیا جائے، ۱۹۵۰ء میں مفکر اسلام مولانا علی میاںؒ نے اپنے برادر اکبر ڈاکٹر عبدالعلیؒ کو خط میں لکھا تھا کہ ''عالم اسلام کا قبلہ تو مکہ معظّمہ اور بیت اللہ ہے اور مرکز اسلام کا قبلہ سردست امریکہ ہے''، مولاناؒ نے لکھا تھا کہ ''خالص عربی لباس میں کتنے دل ودماغ خالص مغربی بن چکے ہیں'' غور کیجئے کہ ۱۹۵۰ء میں مولانا نے کیا دیکھا ہوگا جب اتنی بڑی اور اس قدر گہری بات لکھ دی، لیکن بہر حال ان کی قوت ادراک نے جو کچھ محسوس کیا اور جو کچھ لکھا اسمیں اہلِ بصیرت کے لیے مستقبل کا منظر نامہ تھا، اور وہی ہوا! بدلتے بدلتے اب تو قبلہ یکسر بدل ہی گیا ،عربی لباس بھی اتر گیا، اب تو کھل کر عریانیت، فحاشی، بے حیائی، بے حجابی اور بے شرمی کو فروغ دیا جارہا ہے، سرزمین حرم میں فسق و فجور کی محفلیں سجائی جارہی ہیں، فاسقوں، فاجروں، نچنیوں اور گویّوں کا پرتپاک استقبال کیا جارہا ہے، مرکز توحید میں ہی کلمہ توحید کا مذاق بنایا جارہا ہے، پوری تاریخ میں کلمہ طیبہ کا اتنا مذاق کبھی نہیں بنایا گیا جتنا اس وقت سعودیہ کی سرزمین پر بنایا جارہا ہے، رقص و سرور کی محفلوں میں نعوذ باللہ سرِ عام کلمہ طیبہ کی بے حرمتی کی جارہی ہے، نیم برہنہ محفل میں وہ قومی پرچم لہرایا جارہا ہے جس پر کلمہ طیبہ نقش ومرسوم ہے، کھلے عام شانِ الوہیت وروبوبیت اور حاکمیت الٰہ کا مذاق بنایا رہا ہے، شانِ رسالت میں گستاخی کی جارہی ہے، یہ صرف فکری ونظریاتی اور تہذیبی تبدیلی نہیں، یہ کلمہ اسلام کے خلاف جنگ ہے، یہ اغیار کا کھلا اعلان ہے کہ انہوں نے فکری وثقافتی سطح پر مرکز اسلام کو فتح کرلیا، توحید وسنت کی پاسدار کہی جانے والی مملکت ہی توحید کے معنٰی ومفہوم اور مدلول سے ناآشنا ہوگئی، کلمہ طیبہ کی عظمت وجلالت اور اسکے مدلول ومقتضیات سے بے بہرہ ہوگئی، پھر بھی زبانیں گنگ ہیں، مصلحتوں کے تالے چڑھے ہوئے ہیں، شانِ الٰہی اور شانِ رسالت میں گستاخی پر بھی کوئی ہوک نہیں اٹھتی، اضطراب کی لہریں نہیں اٹھتیں، کیا ہوگیا؟ آخر اسلامی دنیا میں ایسی وحشت اثر خاموشی کیوں چھائی ہے، کھلے عام اللہ ورسول کے نام کا مذاق بنانے پر لوگوں کی چیخیں کیوں نہیں نکل پڑیں، آخر پیرانِ حرم کے لاف وگزاف پر اس قدر اغماض کیوں؟ کیا لوگوں کو نظر نہیں آتا کہ آزادی وثقافت کے نام پر مرکزِ اسلام میں فحش وعریانیت کا کیسا ننگا ناچ ہورہا ہے، دبئ میں زنا کی آزادی فراہم کی جارہی ہے، جس مقام سے نبیؐ روتے ہوئے گذرے تھے اور صحابہ کرامؓ سے کہا تھا کہ اپنے چہروں کو ڈھانپ لو آج پوری ڈھٹائی کے ساتھ اسی جگہ پر ''نیوم'' شہر کو آباد کیا رہا ہے، جہاں ہر چیز کی آزادی ہوگی صرف

شریعت اسلامی پر پابندی ہوگی، مدینہ منورہ میں سنیما گھر بنائے جارہے ہیں، مرکزِ اسلام میں سب سے بڑا فلم فسٹیول ہورہا ہے، شرک مظاہر شرک کے خلاف تحریک بپا کرنے والے اب ناچنے اور تھرکنے والوں کے ہاتھوں کے نشانات محفوظ کررہے ہیں، کیا بعید ہے کہ توحید کے مفہوم و مدلول سے دور ہوتے ہوتے یہ پھر انہی نقوش کی پوجا پاٹ شروع کردیں، یوں بھی جزیرۃ العرب میں شرک کے اڈے پہلے ہی قائم ہوچکے ہیں، پھر بھی اصحاب مناصب، اولوالامر اور ملت کے آزاد اہل دین ودانش خاموش ہیں۔

بنی اغیار کی چاہنے والی دنیا
رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دنیا
ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا
پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا
ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے ، جام رہے

جن تبدیلیوں کی جانب مفکرِ اسلامؒ نے ۱۹۵۰ء میں اشارہ کیا تھا اور حتی المقدور عمر بھر جن کی اصلاح کے لیے وہ کوشاں رہے، وہ اب اپنے پورے رنگ ڈھنگ میں ظاہر ہورہی ہیں، عجیب بات ہے کہ ان تبدیلیوں کی سربراہی بھی اسی خانہ ان کے حصہ میں آئی ہے جس نے ماضی میں آلِ سعود کو سہارا دیا تھا، محمد بن عبدالوہاب کا خاندان ہی تھا جسکی دینی حیثیت کے سہارے آلِ سعود نے حجاز میں اپنے قدم جمائے تھے، بیرونی عنصر کے طور پر انگریزوں کی پشت پناہی حاصل تھی تو داخلی عنصر کے طور پر یہ قبیلہ معاون ومددگار تھا، اس وقت بھی شدت پسندی نے عالمِ اسلام میں ایک ہیجان برپا کرکر دیا تھا، اس شدت پسندی کے اثرات کو علامہ شبیر احمد عثمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی کی تقریروں میں محسوس کیا جاسکتا ہے جو ان حضرات نے مؤتمر اسلامی میں فرمائی تھیں، یہ خاندان اس وقت اصلاح وتجدید کی ایک انتہا پر تھا اور آج کم وبیش ایک صدی بعد افساد وتخریب کی آخری انتہا پر ہے، ان تہذیبی وثقافتی تبدیلیوں کو فروغ دینے کی ذمہ داری اسی خاندان کے ایک فرد ترکی آلِ شیخ کے سپرد ہے، وزارت برائے مذہبی اموران ساری فکری، ثقافتی، تعلیمی واجتماعی تبدیلیوں کو صادر کررہی ہے جسکے سربراہ ڈاکٹر عبداللطیف آلِ شیخ ہیں، اور مفتی مملکت مفتی عبدالعزیز آلِ شیخ کا کیا کہنا!! یہی وہ خاندان تھا جس نے شرک وبدعات کے خلاف جنگ میں پوری دنیا کو اپنا مخالف بنالیا تھا اور آج اسی خاندان کے فرد مفتی عبدالعزیز آلِ شیخ ہیں جو اپنے مضحکہ خیز اور گمراہ کن فتاوی کی تاریخ رقم کررہے ہیں، انھوں نے گذشتہ دنوں اپنے فتوے میں ارشاد فرمایا تھا کہ اسرائیلیوں سے جنگ جائز نہیں، بلکہ حماس سے لڑنے میں اسرائیلیوں کو تعاون فراہم کرنا چاہیئے، انھوں نے اس دور کی جانباز تحریک حماس کو دہشت گرد قرار دیا تھا، عالم اسلام میں نصرتِ اقصی اور غزہ کی مدد کے لیے اٹھنے والی آوازوں کو خیر سے عاری محض شور وغوغا قرار دیا تھا، انھوں نے تو یہاں تک فرمادیا تھا کہ مسجد اقصی اور قدس کے حاکم اسرائیلی ہیں، اس لیے ان کے خلاف خروج جائز نہیں ہے، بلکہ ان کے خلاف کاروائی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مرادف ہے، مفتی صاحب کی ان تصریحات کو پڑھ کر حیران ہوں۔

حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

وہ رابطہ عالم اسلامی جو۱۹۶۲ میں ءایک ایسے اسلامی مرکز کے طور پر قائم کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کو درپیش مسائل وچیلنجز اور مصائب ومشکلات کی اطلاع اس کے ذریعہ سارے عالمِ اسلام کو دی جا سکے، پورے عالمِ اسلام کو جوڑا جا سکے، سب کا تعاون حاصل کیا جا سکے، پوری دنیا کے علماء ودانشوران کو اس کے پلیٹ فورم پر جمع کیا جا سکے، اسلام مخالف حملوں اور پروپیگنڈوں کا اسکے ذریعہ متحدہ جواب دیا جا سکے، اب وہی رابطہ عالمِ اسلامی حکومت کا بھونپو بن کر رہ گیا ہے، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس کی تاسیس کے چند سال بعد ہی حکومت سعودیہ نے اس کی افادیت واہمیت کا اندازہ کر کے اس کا استعمال شروع کر دیا تھا، یہی وجہ تھی کہ اسکے فکری بانی امام حسن البناء کے داماد عظیم اسلامی مفکر ڈاکٹر سعید رمضان کو چند سال بعد ہی اس کی رکنیت سے محروم کر دیا گیا تھا، بلکہ ان کی سعودیہ آمد ورفت پر پابندی عائد کر دی گئی تھی، بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ رابطہ کی تاسیس ڈاکٹر سعید رمضانؒ کے فکر وخیال اور مشورہ کے تحت ہی عمل میں آئی تھی، بقول مولانا علی میاں ندویؒ ''افسوس ہے کہ بعض غلط فہمیوں یا ان کی صاف بیانی وصاف گوئی کی وجہ سے وہ اس کی رکنیت سے محروم کر دیے گئے اور ان کا حجاز آنا جانا موقوف ہو گیا''۔ رابطہ کا پورے طور پر حکومت نے اُس وقت استعمال کیا جب صدام کو خطرہ بتا کر حجاز میں امریکی فوجی چھاؤنی قائم کرنے کے فیصلے پر رابطہ سے مہر ثبت کرائی گئی اور مخلص علماء کی دینی غیرت وحمیت کا نہ صرف استحصال کیا گیا بلکہ انھیں کو یہ وعدہ کر کے دھوکہ دیا گیا کہ خطرہ ٹلتے ہی امریکی فوجی اڈہ ختم کر دیا جائے گا، اب تو وہ رابطہ ملت میں انتشار پیدا کرنے والے فیصلوں کی پشت پناہی کر رہا ہے، اسلام مخالف طاقتوں سے دوستیاں رچانے میں حکومت کی نیابت ونمائندگی کر رہا ہے، حکومتی پروپیگنڈوں کو ساری دنیا میں پھیلانا ہی اس کا وظیفہ وعمل بن چکا ہے، رابطے کے مخلص ارکان خاموش ہو چکے ہیں یا دوری بنا چکے ہیں، کیا خوب ہو کہ مسلسل غیر اسلامی اقدامات کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے پوری دنیا کے مخلص اہل علم ودانشوران پہلے تو نصیحت کا فریضہ انجام دیں اور بات نہ بنے تو پھر اسکی رکنیت سے استعفیٰ دے دیں۔

منکرات وفحشیات کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ وزارت برائے مذہبی امور نے گذشتہ جمعہ مورخہ ۱۰ر دسمبر کو تمام ائمہ وخطباء کو اس کا پابند کیا تھا کہ وہ ''تبلیغی جماعت'' کے انحرافات اور گمراہیوں کو بیان کریں، لوگوں کو بتائیں کہ وہ دہشت گردی کا ایک بڑا دروازہ ہے اور مملکت میں اس پر پابندی ہے، وہاں کے ائمہ وخطباء جو مجبورِ محض ہیں، جن کے منہ میں طاغوتی جبر وتسلط نے اپنی زبان رکھ دی ہے، جو اپنے ساتھیوں اور اصحاب عزیمت علماء کا انجام دیکھ رہے ہیں، انھوں نے اس حکم پر عمل کیا اور اس صراحت کے ساتھ خطبے دیے گئے کہ سو سال قبل بھارت میں جس جماعت تبلیغ کی بنیاد رکھی گئی تھی، اسکے عقائد صحیح نہیں ہیں، وہ تصوف وقبر پرستی میں ملوث جماعت ہے، دھشت گرد جماعت ہے، شاید صدی کا اس سے بڑا اور کوئی لطیفہ نہیں ہوسکتا کہ جس جماعت پر یہ الزام ہے کہ اسکو کلمہ ونماز کے علاوہ مسلمانوں کے معاملات سے کوئی واسطہ اور دلچسپی ہے ہی نہیں، اس جماعت کو دھشت گرد کہا جانا واقعی مضحکہ خیز ہے، بعد میں بعض حضرات نے یہ تاویلات پیش کیں کہ اس حکم نامہ میں تبلیغی جماعت نہیں افریقہ کی جماعت الدعوہ جسکو ''الاحباب'' کہا جاتا ہے وہ مراد ہے، لیکن نص بیان سے صاف واضح تھا کہ اس سے تبلیغی جماعت ہی مراد ہے اور خطبات جمعہ نے اس نص پر مہر لگا دی، اس لیے اب کسی تاویل کی گنجائش نہ رہ گئی، میں افریقی جماعت الدعوہ الاحباب سے واقف نہیں، کوئی ہو تو ہو، لیکن میرا ماننا ہے کہ نص بیان میں جماعت تبلیغ کو ہی احباب کہا گیا ہے، کیونکہ تبلیغ سے

وابستہ افراد ہمارے یہاں ایک دوسرے کے لئے ''ساتھی'' کا استعمال بہت کثرت سے کرتے ہیں اس لیے ممکن ہے کہ عرب ممالک میں اسی معنٰی میں احباب کا لفظ استعمال کرتے ہوں، حکومت سعودیہ جس شدت وسرعت کے ساتھ اسلامی تہذیب وثقافت کے آثار مٹانا چاہتی ہے اور فحش کو فروغ دینا چاہتی ہے، نیکیوں اور بھلائیوں کو فروغ دینے والی یہ جماعت اس راہ کا سب سے بڑا روڑا بن سکتی ہے جو صرف معروف کا حکم دیتی ہے، شراب وکباب کے رسیا کو میخانوں سے نکال کر مسجدوں میں لانے کی موثر و تابناک تاریخ رکھتی ہے، نظریاتی وفکری اور فلسفیانہ بحثوں سے قطع نظر عمل پر ابھارتی ہے اور کم از کم نمازی بنا کر چھوڑتی ہے، آگے کا کام دیگر شعبوں میں کام کرنے والوں کے لئے چھوڑ دیتی ہے، گویا اسکی محنت دین کی بنیادی سطح پر ہوتی ہے اور وہ اتنی مؤثر ہوتی ہے کہ منکرات کا سیلِ رواں بھی ٹک نہیں پاتا، اس سے وابستہ افراد خالص فسق وفجور کے ماحول میں بھی نظریں جھکائے رہتے ہیں اور وقت پر اپنی نماز پڑھ لیتے ہیں۔

یہ حکم نامہ اس حیثیت سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ عالم اسلام کی قسمت کا ٹھیکیدار سعودی عرب کو نہیں بنایا جا سکتا، کسی عیاش حکمراں کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ عالمِ اسلام کی تقدیر کے فیصلے کرے، جس تحریک کو چاہے کافر وگمراہ کہے، جن شخصیات کو چاہے دہشت گرد قرار دے اور جن کی چاہے تکریم کرے، اس کی پسند و ناپسند اور اس کی خواہشات کے سبب دنیا بھر میں انتشار واختلاف کا بازار گرم رہے، یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ سعودی عرب میں مولانا علی میاں ندویؒ کی کتاب '' **الـــــداعية الـكبيـر الشيـخ محمد الياس الكاندهلوى و دعوته إلى الله** '' چھپتی اور پڑھی جاتی رہے، پھر اس دعوت کی تحریک پر پابندی لگادی جائے، ''**مـاذا خسـر الـعـالم بانحطاط المسلمين** '' جامعات میں داخل رہے اور پھر اسے دہشت گردی اور خارجی فکر کے فروغ کا ذریعہ بتا کر پابندی عائد کردی جائے'' مولانا علی میاںؒ، مولانا مودودی اور یوسف قرضاوی کو ان کی علمی، تصنیفی اور اسلامی خدمات کے سبب شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا جائے پھر ان ہی کے لٹریچر پر مملکت میں پابندی عائد کردی جائے، کسی سرپھری حکومت کو ایسے متضاد فیصلوں کا اختیار نہیں دیا جا سکتا جسکے فیصلے پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے حیرانی و پریشانی اور قید و بند کا سبب بنیں، سعودیہ کے اقدامات کا راست اثر بھارت کی فاشسٹ حکومت کی پالیسیوں پر پڑ سکتا ہے، اس وقت حرمین کی تولیت کا جو لوگ دعوی کررہے ہیں ان کی بابت بس یہی کہا جا سکتا ہے جو قرآن مجید نے سورہ توبہ میں کفار ومشرکین مکہ کے بارے میں کہا تھا، یہ لوگ مغرب کی غلامی میں مقابلہ آرائی کررہے ہیں، اقتدار کے تحفظ کی خاطر قرآن کی صریح تعلیمات سے جنگ چھیڑ رکھی ہے، مرکز وحی کے تقدس کو بھی تباہ و پامال کررہے ہیں، قرآن کی آیات کو پس پشت ڈال کر دنیا کی زائل ہوجانے والی حقیر پونجی کو ترجیح دے رکھی ہے، لوگوں کو اسلام پر عمل کرنے، اسلام کو پھیلانے، توحید کی بات کرنے اور نبوت کے پیغام کو عام کرنے سے روک رہے ہیں، یہ سارے وہی بدترین کام ہے جو اُس وقت کفار مکہ کرتے تھے تو قرآن نے کہا تھا... اشتـرو بـآيـاتــه ثـمنًا قليلًا فصدوا عن سبيله إنهم ساء ماكانوا يعملون (توبہ۱۰)

مرکزِ اسلام اور پورے جزیرۃ العرب میں آزادی وثقافت کے نام پر جس بے حیائی اور فحاشی کو فروغ دیا جارہا ہے اس کے پیچھے جو طاقتیں اور جو حکمراں پشت پناہی کررہے ہیں، انھیں اچھی طرح سورہ نور کی اس آیت اور وعید کو پڑھ لینا چاہیے... إن الـذيـن يحبون أن تشيع الفاحشة فى الذين اٰمنوا لهم عذاب أليم فى الدنيا و الأخرة والله يعلم و أنتم لاتــعــلــمـون (نور۱۹) جو لوگ بھی مسلمانوں کے درمیان بے حیائی وفحاشی کو رواج دینا چاہتے ہیں ان کے لیے اس دنیا میں بھی

دردناک مصیبتیں ہیں اور اگر وہ باز نہ آئے، توبہ نہ کی تو آخرت میں بھی ان کو بدترین سزا ملے گی، وہ لاکھ اپنی کرتوتوں پر پردے ڈالیں، غلاف کعبہ اوڑھ لیں، خدمتِ حرمین کی چادر میں اپنے جرائم کو چھپالیں لیکن صرف انسانوں سے چھپا سکتے ہیں، جبہ ودستار کی سفیدی سے صرف انسان دھوکہ کھا سکتے ہیں اللہ کو خوب معلوم ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور کیا کر رہے ہیں، گرچہ اس آیت کا راست تعلق ان منافقین سے ہے جنھوں نے اہل بیت اطہار پر نشانہ سادھا تھا، لیکن اس میں وارد وعید قیامت تک آنے والے ان تمام مجرمین کے لیے ہے جو اہل ایمان کو گمراہی کے راستے پر ڈالنا چاہتے ہیں، جو سینیما کو فروغ دینا چاہتے ہیں، جو فحاشی گری کو فروغ دینا چاہتے ہیں، جو رقاصاؤں کا استقبال کرتے ہیں، جو بداخلاقی، فحاشی اور بے حیائی کو فروغ دینے والے وسائل کو عام کرنے پر آمادہ ہیں، جو مسلم معاشرے کی پاکیزگی ختم کر کے اخلاقی انارکی اور بدکاری کو رواج دینا چاہتے ہیں، جو قرآن مجید کی پابندیوں کو کنارے لگا کر مذہبی حدود وقیود سے آزاد معاشرہ تشکیل دینا چاہتے ہیں۔

جو لوگ جزیرۃ العرب کے فساد وتخریب کو کسی ایک ملک کا معاملہ سمجھتے ہیں، جو حکومت سعودیہ کے مذہبی معاملات اور تخریبی بیانات کو ان کا خاص معاملہ کہہ کر دامن چھڑانا چاہتے ہیں، انھیں سمجھنا چاہیے کہ سعودیہ کا معاملہ کسی عام ملک کا معاملہ نہیں ہے، وہ مہبط وحی اور مرکزِ اسلام ہے، اور ان کے حکمرانوں کو حرم کی تولیت کا دعویٰ ہے، خدمتِ حرمین ان کی افضلیت کے طور پر پیش کی جاتی ہے، قرآن مجید نے سورہ توبہ کی آیات ۱۷ تا ۱۹ میں جہاں قریش کی تولیت حرم کے استحقاق کو ختم کرنے کا اعلان کیا ہے وہاں یہ بھی بیان کر دیا ہے کہ حرم کی تولیت کا حق کون لوگ رکھتے ہیں، متولیانِ حرم کی کیا کیا خصوصیات وصفات ہونی چاہئیں، خاص بات یہ ہے کہ اس بیان میں اللہ تعالی نے ''مساجد اللہ'' کہہ کر مسجدِ حرام کو مراد لیا ہے، اس لیے کہ مسجدِ حرام کا معاملہ تنہا اس کا نہیں ہے، وہ تمام مساجد کا قبلہ اور دنیا کے تمام مسلمانوں کا مرکز ہے، وہاں کے ہر خیر کا اثر ساری دنیا کے مسلمانوں تک پہنچتا ہے، وہاں سے جو دعوت برپا ہوئی اس نے سارے عالم کو متاثر کیا، وہاں کی تہذیب وثقافت کا رنگ ساری دنیا کے مسلمانوں میں دیکھا جا سکتا ہے، مسلمان دنیا کے کسی کونے میں بستے ہوں، ان کی زبان ونسل کوئی بھی ہو مگر ان پر اسلامی تہذیب وثقافت کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں، چنانچہ اگر وہاں کے انتظام و انصرام میں کوئی فساد برپا ہوا، حرم کے مقاصد اور حرم کی دعوت میں کوئی خرابی آئی، وہاں سے شر کی دعوت عام ہوئی تو گویا مرکز اسلام کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو گیا جس کے اثرات ساری دنیا میں منتقل ہونا لازم ہے، اس لیے وہاں کے کسی بھی بیان واقدام سے بے اعتنائی نہیں برتی جا سکتی، وہاں کے لوگ اگر سرمۂ افرنگ سے اپنی آنکھیں سجانے لگیں، تہذیب افرنگ سے فضائے حجاز کی پاکیزگی اور تقدس کو ناپاک کرنے لگیں، اسلام کی من چاہی تشریح کرنے لگیں تو اغماض واعراض ممکن ہی نہیں ہے۔

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟
اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ، مُلّا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم؟

چنانچہ جن علمائے ملت اسلامیہ کو آج بھی دلوں کی آزادی حاصل ہے، جن کے زبان وقلم پر شاہی جبر کا تسلط نہیں ہے، جو دل کے بادشاہ ہیں، شکم پروری کی فکر سے آزاد ہیں، ان کو چاہیے کہ حالات کی سنگینی کو سمجھیں، سرزمین حرم میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا نوٹس لیں اور متحدہ موقف اختیار کریں، ضرورت ہے سخت اور متحدہ موقف کی، انفرادی کوششوں میں بے اعتدالی بھی ہو

سکتی ہے، نقصان بھی ہوسکتا ہے، منفی اثرات بھی پڑ سکتے ہیں لیکن رہبران ملت سر جوڑ کر بیٹھ جائیں اور سرزمینِ حرم کے تقدس و خصوصیت کے پیشِ نظر وہاں کے حکومتی اقدامات کے خلاف متحدہ موقف اختیار کریں، نصح وارشاد کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اجتماعی بیانات جاری کریں تو کوئی مانع نہیں کہ اسلام کی شبیہ کو داغدار کرنے والوں پر لگام نہ لگے، اگر اتنا سب ہوجانے کے بعد بھی ہماری طرف سے موثر اقدام نہیں کیا گیا تو اقبال کی زبان میں کہنا پڑے گا۔

دل سوز سے خالی ہے، نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے
ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل! تو تیرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

ہر وقت یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ بحیثیت فرد ملت اور بحیثیت امت ہم جو کر سکتے ہوں وہ کر گزرنا چاہیے، ہر شخص اپنی بساط بھر کام کرنے کا مکلّف ہے، منکرات کو روکنے کے لیے کوئی کوشش نہ کی جائے، ہر نئے طوفان کو خاموشی سے ٹال دیا جائے، سنگینیٔ حالات سے چشم پوشی اور حالات کا مقابلہ نہ کرنا ہی زوال کی اصل وجہ ہے، بنی اسرائیل کے زوال ومحرومی کی صرف یہ وجہ نہیں تھی کہ وہ منکرات کا ارتکاب کرتے تھے، حرام کو حلال کرتے تھے، ہر وہ جرم کرتے تھے جو اللہ کی نظر میں بدترین گناہ تھا، اللہ نے لعنتیں برسانے کی صرف یہ وجہ نہیں ذکر کی، کہ وہ حدودِ شریعت سے تجاوز کرتے تھے، بلکہ صاف طور پر یہ بھی ذکر کیا کہ ان پر انبیاء کی زبان سے لعنتوں کی بارش کرنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے درمیان لوگوں کے جرائم، مظالم اور منکرات پر خاموشی اختیار کرتے تھے، حرام کاریوں اور شریعت مخالف کاروائیوں پر آنکھیں بند کر لیتے تھے، گویا وہ دوہرا جرم کرتے تھے، کہ منکر کی نکیر نہیں کرتے تھے، ظلم و ناانصافی اور بے حیائی وفحاشی پر خاموش رہتے تھے، گویا مصلحت ومفادات کے سبب مظالم وجرائم پر خاموش رہنا اور صرفِ نظر کرنا رحمتِ الٰہی سے محرومی کا اہم سبب اور موجبِ لعنت ہے، اگر یہی طرز وطور ہماری امتِ مسلمہ میں عام ہوجائے تو بنی اسرائیل والا نتیجہ بھی جھیلنا ہی پڑے گا، لہذا اس کے علاوہ کوئی چارہ ہے ہی نہیں کہ منکرات کی نکیر کی جائے، ظلم کو ظلم اور باطل کو باطل کہا جائے، اگر اسلام کی دھجیاں اڑانے والوں کی نکیر نہ کی گئی، سرزمینِ حرم کے تقدس کو پامال کرنے والوں اور وہاں عریانیت وفحاشی کو رواج دینے والوں کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا گیا کہ ہمیں ان کی پالیسیوں سے کیا بحث تو خدانخواستہ اللہ کی طرف سے مار پڑنا اور پھٹکار برسنا یقینی اور طے شدہ ہے، خدا تعالی نے متنبہ کرنے کے لیے ہی سورہ مائدہ میں بنی اسرائیل کا یہ حال بیان کیا ہے:

لعن الذين كفروا من بنى اسرائل على لسان داؤد وعيسى بن مريم ذٰلك بما عصوا وكانو يعتدون ، كانوا لايتناهون عن منكر فعلوه لبئس ماكانوا يفعلون (مائدہ ۷۸۔۷۹)

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی)

☆☆☆

❑ فکر ونظر

مساجد میں خواتین کی آمد
ایک تاریخی وفقہی مطالعہ

مولانا الیاس نعمانی، لکھنؤ

مساجد کا مقام اور کردار:

امت مسلمہ کے لیے مسجد کی حیثیت صرف ایسی عبادت گاہ کی نہیں ہے جہاں مسلمان چند رکعت نمازیں پڑھنے کے ارادہ سے تھوڑی دیر کے لیے آئیں اور چلے جائیں، رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات اور آپ کے اسوۂ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نگاہ میں مسجد مسلم معاشرہ کی پوری دینی زندگی کا محور تھی، اور اسے آپ مسلمانوں کی دینی تعلیم وتربیت کا ایک ایسا نہایت سرگرم مرکز دیکھنا چاہتے تھے جہاں سے ان کا ہر فرد بنیادی دینی علم اور صحیح دینی شعور حاصل کرے، نیز اس کی اصلاح وتربیت وذہن سازی کا عظیم کام بھی وہیں سے انجام پائے۔

مسجد نبوی کا اسوہ:

رسول اللہ ﷺ کے عہد میں آپ کی مسجد تعلیم گاہ بھی تھی، اور تربیت وتزکیہ کا ایک بے مثال مرکز بھی، وہاں باقاعدہ تعلیمی حلقے لگتے تھے، ذکر کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، وعظ وارشاد کا سلسلہ قائم رہتا تھا، ہفتہ میں ایک بار تو جمعہ کا خطبہ ہوتا، جس میں پورے مدینہ اور گرد وپیش کی بستیوں کے مسلمان جمع ہوتے، اور آپ ان کو اپنی ہدایات ومواعظ سے مستفید فرماتے، اس کے علاوہ فجر کی نماز کے بعد آفتاب طلوع ہونے تک بالعموم آپ اپنے مصلے پر ہی تشریف رکھتے، [مسلم: کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب فضل الجلوس في مصلاہ بعد صلاۃ الصبح، حدیث نمبر: ۶۷۰] علامہ سید سلیمان ندویؒ تحریر فرماتے ہیں: ''اور یہی وقت دربار نبوت کا ہوتا، لوگ پاس آکر بیٹھتے، اور آپ ان کو مواعظ ونصائح تلقین فرماتے [سیرت النبی، ۲/۲۱۲، مطبوعہ: دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۴۰۵ھ]۔ اور علامہ شبلی نعمانیؒ کا خیال ہے کہ: ''.....اس قسم کی مجالس کے لیے جو خاص وقت مقرر تھا وہ صبح کا تھا، فجر کے بعد آپ بیٹھ جاتے اور فیوض روحانی کا سرچشمہ جاری ہوجاتا [حوالۂ بالا، ۲/۲۲۹]''۔

متعدد روایات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر نمازوں کے بعد بھی موقع بموقع آپ ﷺ مسجد میں تشریف رکھتے، اور لوگوں کو خطاب فرماتے، ان کے علاوہ بھی کبھی کبھی آپ مسجد میں تشریف لے آتے اور لوگوں کو نصیحت فرماتے یا دین کے احکام کی تعلیم دیتے۔

آپ کی عدم موجودگی میں بھی صحابہ کے تعلیم وذکر کے حلقے لگتے، جن میں صحابہ باقاعدہ تعلیمی مذاکرے کرتے، کوئی معلم ہوتا جس سے دوسرے علم حاصل کرتے، ایسے ہی

ایک موقع کا ذکر ہے کہ آپ مسجد میں تشریف لائے، دیکھا دو حلقے لگے ہوئے ہیں، ایک حلقہ میں تعلیم ہورہی ہے تو دوسرے حلقہ میں ذکر ہورہا ہے، آپ نے دونوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، لیکن تعلیم والے حلقہ کو زیادہ افضل بتایا[ابن ماجہ: مقدمہ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، حدیث نمبر:۲۲۹]۔ بعض روایات سے ان مجلسوں میں تعلیم کی صورت وترتیب واضح ہوتی ہے، مثلاً حضرت جندب بن عبداللہؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ایمان (عقائد) کی تعلیم ہوتی اور پھر قرآن مجید کی تعلیم کا آغاز ہوتا[ابن ماجہ: مقدمہ: باب في الایمان، حدیث نمبر:۶۱]، ایک اور روایت سے قرآن مجید کی تعلیم کا یہ طرز معلوم ہوتا ہے کہ پہلے (تقریباً) دس آیات پڑھادی جاتیں یا یاد کرادی جاتیں، پھر ان کی تفسیر پڑھائی جاتی، اور عملی تقاضے واضح کیے جاتے، پھر اگلی دس آیات کی اسی طرح تعلیم ہوتی[مسند احمد، مسند الانصار، حدیث رجل من أصحاب النبي ﷺ، حدیث نمبر:۲۳۴۸۲]۔

مسجد میں ہونے والی ان تعلیمی سرگرمیوں میں شریک ہونے کے فضائل بتا کر رسول ﷺ لوگوں کو ان میں شرکت کی ترغیب دیتے، مثلاً ایک مرتبہ فرمایا: ''میری اس مسجد میں جو شخص خیر کا علم سیکھنے یا سکھانے کی نیت سے ہی آتا ہے وہ مجاہد فی سبیل اللہ کے مثل ہے''[ابن ماجہ: مقدمہ: باب فضل العلماء، حدیث نمبر:۲۲۷]۔

اس کے علاوہ ایسے طالب علموں کے لیے جن کے پاس مدینہ میں قیام کا کوئی بندوبست نہ ہو مسجد کے ایک حصہ میں (یا مسجد سے ملحق) ایک 'صُفّہ' (چبوترا) بنادیا گیا تھا جس میں وہ قیام کرسکیں۔

مسلم امت کی تعلیم وتربیت کے علاوہ بھی یہاں متعدد کام انجام پاتے، اسی مسجد میں بالعموم نوخیز مسلم مملکت کے لیے شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوتا، عدالت قائم ہوتی، مدینہ منورہ کے سماجی مسائل حل ہوتے، غریبوں کے لیے فوری امداد کی کوششیں ہوتیں، اور بھی بہت کچھ ہوتا؛ لیکن ذخیرۂ حدیث وسیرت سے بالکل واضح ہے کہ سب سے زیادہ جوسرگرمی رسول اکرم ﷺ کی مسجد میں انجام پاتی وہ تعلیم وتربیت کے حلقے اور وعظ وارشاد کی مجلسیں تھیں۔

اورخواتین.....:

آپ ﷺ کی اس مسجد میں خواتین بھی نماز میں شریک ہوتیں، اور بڑی تعداد میں ہوتیں، جس کا اندازہ ان روایات سے بخوبی ہوسکتا ہے جن میں خواتین کی کئی صفوں کا تذکرہ ملتا ہے[مثلاً ملاحظہ ہو: مسلم: کتاب الصلاۃ، باب تسویۃ الصفوف واقامتہا، حدیث نمبر:۴۴۰، صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب قصۃ الجساسۃ، حدیث نمبر:۲۹۴۲]، خیال رہے کہ یہ صفیں خاصی لمبی ہوتی تھیں، اس لیے کہ مسجد نبوی کی اولین تعمیر کے وقت ہی مسجد کی چوڑائی تیس میٹر تھی، اور غزوۂ خیبر کے بعد جب مسجد میں مزید توسیع ہوئی تو مسجد کی چوڑائی پچاس میٹر ہوگئی، [تاریخ المسجد النبوی الشریف، از: محمد الیاس عبد الغنی، ص:۴۱، ۴۲، طبع اول، ۱۹۹۶ء) ایک میٹر میں بسہولت دو خواتین نماز کے لیے کھڑی ہوسکتی ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نماز باجماعت میں خواتین کی کتنی تعداد شریک ہوتی تھی؛ بلکہ صحیح بخاری وصحیح مسلم سمیت متعدد کتب حدیث میں درج ایک روایت تو بتاتی ہے کہ خواتین (غالباً رات کی) نفل نمازیں بھی دیر تک مسجد میں پڑھتی تھیں، یہ حضرت انسؓ کی روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ مسجد میں داخل ہوئے، تو آپ نے دیکھا کہ مسجد کے دوستونوں کے درمیان ایک رسی بندھی ہوئی ہے، دریافت فرمایا: یہ کیا ہے؟ حاضرین نے عرض کیا کہ حضرت زینب کی رسی ہے، وہ (نفل نمازیں پڑھتے پڑھتے) تھک جاتی ہیں تو اس سے لٹکتی

ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ رسی کھول دو، جب تک نشاط رہا کرے تب تک ہی نماز پڑھا کرو، اور جب نشاط نہ رہے تو بیٹھ جایا کرو[صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب أمر من نعس في صلاتہ.....، حدیث نمبر:۷۸۴]۔

صحیح مسلم کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عاشورا (دس محرم) کے دن صحابیات بھی مسجد میں خاصا وقت گزارا کرتیں[صحیح مسلم: کتاب الصیام، باب من أکل في عاشوراء فلیکف بقیۃ صومہ، حدیث نمبر:۱۱۳۶]۔

اس کے علاوہ متعدد روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کی طرح خواتین کے لیے بھی ایک مخصوص 'صُفّہ' مسجد نبوی میں (یا مسجد نبوی سے ملحق) موجود تھا[مثلاً ملاحظہ ہو: ابوداؤد: أوّل کتاب الحدود، باب ما یقطع فیہ السارق، حدیث نمبر:۴۳۸۶، مسند احمد: مسند النساء، مسند بقیرۃ، ۲۷۱۳۰]، بظاہر اس کی تعمیر کا مقصد بھی وہی ہوگا جس کے پیش نظر مردوں کا معروف 'صُفّہ' تعمیر کیا گیا تھا۔

ذخیرۂ احادیث میں ایک ایسی سیاہ فام خاتون کا بھی تذکرہ ملتا ہے جو مسجد نبوی میں جھاڑو لگایا کرتی تھیں۔[ابن ماجہ: کتاب الجنائز، باب ما جاء في الصلاۃ علی القبر، حدیث نمبر:۱۵۲۷]۔

روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کی مسجد آمد صرف مسجد نبوی تک ہی نہیں محدود تھی، بلکہ دیگر مقامات پر بھی باجماعت نماز میں خواتین حاضر ہوا کرتی تھیں[مثلا ملاحظہ ہو: سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب من أحق بالامامۃ، حدیث نمبر:۵۸۵]۔

● ایک لائق توجہ بات:

ذخیرۂ حدیث کی متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں بعض حضرات کو اپنے گھر کی خواتین کو مسجد آنے کی اجازت دینے کے سلسلے میں تذبذب ہوتا تھا، لیکن ایسے حضرات کو رسول اللہ ﷺ نے یہ واضح ہدایت دی تھی کہ وہ اپنی خواتین کو مسجد آنے سے نہ روکیں، صحیح بخاری و صحیح مسلم سمیت متعدد حدیث کی کتابوں میں اس موقع کا آپ کا ارشاد ان الفاظ میں روایت کیا گیا ہے: ''لا تَمْنَعُوا إماءَ اللّٰہِ مَسَاجِدَ اللّٰہ'' (اللہ کی بندیوں کو مسجد آنے سے نہ روکو)۔ ہاں البتہ آپ ﷺ نے خواتین کو یہ ہدایت ضرور فرمائی کہ وہ مساجد آتے وقت اپنی ہیئت کو سادہ و بے زینت رکھیں[ابوداود، کتاب الصلاۃ، باب ما جاء في خروج النساء الی المسجد، حدیث نمبر:۵۶۵]۔

عہد نبوی کے بعد

● خلافت راشدہ میں:

حدیث و تاریخ کی کتابوں اور روایات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین کی مسجد آمد کا جو سلسلہ عہد نبوی میں جاری ہوا تھا، وہ خلافت راشدہ اور اس کے بعد کے عہدوں میں جاری و ساری رہا، خواتین مساجد میں آتی رہیں، فرض نمازوں میں باجماعت شریک ہوتی رہیں، بلکہ جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں تراویح کی نماز کا باقاعدہ نظام بنایا گیا تو اس غیر فرض نماز کے لیے بھی خواتین کی جماعت کا اہتمام مسجد کے صحن میں کیا گیا، جس کی امامت حضرت سلیمان بن ابی حثمہ فرماتے تھے، پھر عہد عثمانی میں تراویح کی جماعت میں بھی دوسری نمازوں کی طرح مردوں اور عورتوں کی ایک ہی جماعت ہونے لگی۔ [طبقات ابن سعد، ۳۰/۷، مطبوعہ قاہرہ، مصر] اس عہد میں بھی گو کہ مسلم معاشرہ کے بعض افراد کو مساجد میں خواتین کی آمد پر بعض اشکالات رہے، مثلا حضرت عائشہؓ کا یہ ارشاد بہت مشہور ہے کہ: ''اگر رسول اللہ ﷺ آج کی خواتین کو دیکھ لیتے تو انھیں مسجد آنے سے روک دیتے'' [مسند احمد: مسند عائشہ، حدیث نمبر:۲۴۴۰۶]۔ لیکن یہ سچ ہے کہ جمہور

علمائے صحابہ کی رائے ممانعت کی نہیں ہوئی، اور خواتین مساجد میں آتی رہیں۔

ایک غلط بات جو مشہور ہوگئی:

ہمارے بعض علما وفقہا کے یہاں یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں خواتین کو مسجد آنے سے روک دیا تھا، لیکن یہ ایک بے بنیاد بات ہے جو نہ جانے کیوں مشہور ہوگئی، حدیث وتاریخ کی کسی روایت سے اس کی تائید نہیں ہوتی، بلکہ متعدد روایات سے اس کا غلط اور بے بنیاد ہونا ثابت ہوتا ہے، مثلا مسند احمد کی ایک صحیح روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی حیات طیبہ میں جو آخری نماز مسجد نبوی میں ادا فرمائی تھی، جس میں ان پر جان لیوا حملہ ہوا تھا اس نماز میں بھی ان کی اہلیہ مسجد میں حاضر تھیں [مسند احمد، مسند عبداللہ بن عمر ۴۵۲۲]، ظاہر ہے کہ اگر حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں خواتین کی مسجد آمد پر پابندی لگادی ہوتی تو ان کی آخری باجماعت نماز میں ان کی اہلیہ مسجد میں کیسے موجود ہوتیں۔

ایک اور روایت بھی (جس کا تعلق بھی حضرت عمر فاروقؓ کے ہی گھرانے سے ہے) یہ ثابت کرتی ہے کہ خواتین کی مسجد حاضری پر کوئی ممانعت نہیں کی گئی تھی، یہ روایت صحیح مسلم ودیگر کتبِ حدیث میں درج ہوئی ہے، اس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یہ حدیثِ نبوی نقل کی کہ: ''اگر تمھاری خواتین مساجد میں حاضری کی اجازت تم سے چاہیں تو انھیں منع نہ کرنا''، یہ سن کر ان کے صاحبزادے حضرت بلال بن عبداللہ نے عرض کیا کہ ''بخدا ہم تو روکیں گے''، حضرت عبداللہ بن عمر نے اپنے بیٹے کی زبان سے یہ بات سنی تو ان پر ایسی سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا کہ ان کے ایک اور صاحبزادے حضرت سالم کا بیان ہے کہ میں نے اپنے والد کو ایسے سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے کبھی اور نہیں سنا، پھر فرمایا: ''میں تمھیں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد سناتا ہوں اور تم کہتے ہو کہ بخدا ہم تو روکیں گے''، [صحیح مسلم، ۴۴۲، کتاب الصلاۃ، باب خروج النساء الی المساجد]، مسند احمد کی روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر اپنے ان صاحبزادے سے ایسے ناراض ہوئے کہ پھر وفات تک ان سے گفتگو نہیں فرمائی [مسند احمد، مسند عبداللہ بن عمر، حدیث نمبر: ۴۹۳۳]۔

ظاہر کہ یہ تمام باتیں بتاتی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں خواتین کی مسجد حاضری پر پابندی نہیں لگائی تھی، اس لیے کہ اگر یہ پابندی لگ گئی ہوتی تو کبھی بھی حضرت عبد اللہ بن عمر اور ان کے صاحبزادے کے درمیان یہ گفتگو نہ ہوئی ہوتی، اور نہ آپ اپنے صاحب زادے پر اس طرح خفا ہوئے ہوتے۔ حضرت عمر کی جانب اس پابندی کی نسبت کے غلط ہونے کا ایک اور ثبوت عہد عثمانی میں تراویح کی نماز میں خواتین کی حاضری کی وہ روایت بھی ہے جو ابھی آپ نے اوپر پڑھی ہے۔

بہر حال ان تمام دلائل وروایات سے یہ بات بالکل ثابت ہوجاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کی جانب خواتین کی مسجد آمد پر پابندی لگائے جانے کی نسبت بالکل غلط ہے۔

● خلافت راشدہ کے بعد:

خلافت راشدہ کے بعد بھی خواتین کی مسجد آمد کا سلسلہ جاری رہا، جو آج تک بلا انقطاع عالم اسلام کے اکثر حصوں میں جاری ہے؛ بلکہ خلافت راشدہ کے بعد مساجد کے اندر خواتین کی سرگرمیوں کی فہرست میں ایک حیرت ناک اضافہ ہوا، اب تک تو وہ مساجد میں صرف نمازیں پڑھتیں اور خطبات ومواعظ سنتیں، اب مساجد میں کچھ باکمال خواتین کے درس ومواعظ کے حلقے بھی لگنے لگے، تراجم وطبقات کی کتابوں میں ایسی بہت سی خواتین کے تذکرے ملتے ہیں جو مساجد میں درس دیتیں، یا ان کی وعظ ونصائح کی مجلسیں مساجد میں منعقد ہوتیں، ہم ایسی چند خواتین کا مختصر تذکرہ ذیل میں کررہے ہیں،

جس سے اس وقت کے مسلم معاشرہ میں خواتین کی دینی سرگرمیوں اور علمی شغف و دلچسپیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

۱-معروف صحابی حضرت ابو درداءؓ کی دوسری اہلیہ ام درداء الصغیرۃ (م ۸۲ھ) کا شمار عہد تابعین کی ممتاز ترین اہل علم خواتین میں ہوتا ہے، امام ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ان کا حلقۂ درس جامع دمشق کے شمالی حصہ میں لگتا تھا، جس میں مرد بھی شرکت کرتے تھے، یہاں تک کہ امیر المومنین عبد الملک بن مروان، جو خود بھی اپنے زمانے کے ممتاز ترین علما میں سے ایک تھے، ان کے حلقہ میں بیٹھا کرتے (البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر: ۹/۵۳، مطبوعہ: دار الکتب العلمیۃ، لبنان)۔

۲-ام الکرام کریمہ بنت احمد المروزیہ (م ۴۶۳ھ) اپنے عہد کی ممتاز محدثہ تھیں، صحیح بخاری کا ان کا نسخہ معتبر ترین نسخوں میں سے ایک ہے، حافظ ابن حجرؒ نے اپنی شرح بخاری فتح الباری میں بلا مبالغہ سیکڑوں مقامات پر ان کے نسخے کا حوالہ دیا ہے، خطیب بغدادی جیسے امام و محدث وقت نے ان کی خدمت میں صحیح بخاری کا ان کا نسخہ پڑھ کر اجازت لی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس محدثہ و مسندۂ وقت نے زندگی کا بڑا حصہ مسجد حرام مکۂ مکرمہ کے اندر گزارا (سیر اعلام النبلاء، ذہبی: ۱۸/۲۳۳-۲۳۵، مطبوعہ: مؤسسۃ الرسالہ)۔

۳- حافظ ابن عساکرؒ (م ۵۷۱ھ) نے اپنی معروف کتاب 'تاریخ دمشق' میں ایک اپنی ہم عصر خاتون فاطمہ بنت سہلؒ کا تذکرہ کیا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ وہ 'العالمۃ الصغیرۃ' کے نام سے معروف تھیں، اور ایک مسجد میں وعظ کہا کرتی تھیں۔ (تاریخ مدینۃ دمشق، ابن عساکر: ۷۰/۲۵، مطبوعہ: دار الکتب العلمیۃ، لبنان)

۴- ام محمد سارہ بنت شمس الدین (م ۷۱۷ھ)، حافظ البرزالیؒ نے لکھا ہے کہ خود انھوں نے حطیم (مسجد حرام، مکہ مکرمہ) میں ام سارہ سے حدیث کا درس لیا (الوفیات، حافظ البرزالی: ۴۳۲، مطبوعہ: کویت)۔

۵- زینب بنت احمد مقدسیہ (م ۷۴۰ھ) آٹھویں صدی ہجری کی معروف محدثہ تھیں، 'بنت الکمال' کے نام سے معروف تھیں، امام ذہبی، ابن بطوطہ اور تاج الدین سبکی جیسے عباقرۂ وقت ان کے شاگرد تھے، ابن حجر نے لکھا ہے کہ ان کے درس میں طلبہ کا ازدحام رہتا، ابن العماد نے شذرات الذہب میں لکھا ہے کہ دور دور سے طلبہ ان سے حصولِ علم کے لیے رخت سفر باندھتے، معروف سیاح ابن بطوطہ جب دمشق پہنچا تو جامع اموی میں ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوا (الاعلام، زرکلی، ۳/۶۵، مطبوعہ: دار العلم للملایین، شذرات الذہب، ابن العماد، ۶/۵۵ [شاملہ]، أعلام النساء، عمر رضا کحالہ، ۲/۴۷)۔

اسلامی تاریخ میں خواتین کی مساجد میں حاضری کے سلسلے میں جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے وہ درحقیقت حد درجہ اختصار کے ساتھ عرض کیا گیا ہے، ورنہ عہد نبوی سے لے کر اب تک مسلم خواتین کی مساجد میں حاضری اور وہاں کے خیر سے ان کے استفادہ کی مکمل تاریخ شاید متعدد جلدوں پر مشتمل ایک تصنیف میں سما سکے، حدیث و سیرت اور تاریخ و تراجم کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح اور ناقابل تردید حقیقت کی صورت میں سامنے آتی ہے کہ قرون اولیٰ اور بعد کے زمانوں میں مسلم خواتین کی ایک بڑی تعداد مساجد اور عیدگاہوں میں حاضر ہوتی، نمازیں پڑھتی، دروس اور مواعظ کی مجلسوں میں شرکت کرتی، اور مسلم معاشرہ میں یہ چیز کچھ معیوب نہ سمجھی جاتی۔

مساجد میں خواتین کی آمد کا شرعی حکم

فقہائے اسلام کی اکثریت چند شرطوں کے ساتھ مساجد میں خواتین کی حاضری کی اجازت دیتی ہے، البتہ

فقہائے احناف کا موقف کچھ تفصیل چاہتا ہے، جو ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

فقہائے متقدمین کے بعض اقوال میں اس کو جائز قرار دیا گیا ہے، مثلا امام سرخسیؒ نے اپنی کتاب المبسوط میں امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول بروایتِ حسن بن زیادؒ یہ نقل کیا ہے کہ خواتین کے لیے مسجد میں اعتکاف جائز ہے، گوکہ ان کا گھر میں اعتکاف کرنا زیادہ بہتر ہے، امام سرخسی نے اسی قول کو صحیح بھی کہا ہے [المبسوط، ۱۱۹/۳، مطبوعہ: دارالمعرفۃ، بیروت]۔

لیکن متقدمین کے اکثر اقوال میں خواتین کی مسجد حاضری کو 'مکروہ' قرار دیا گیا ہے، جس سے مراد 'مکروہ تنزیہی' ہے، 'مکروہ تحریمی' نہیں، (مکروہ تنزیہی' اس عمل کو کہتے ہیں جس کا کرنا جائز تو ہو لیکن خلافِ اولیٰ ہو، یعنی اس کا نہ کرنا زیادہ بہتر ہو، اور کرنے میں کوئی گناہ نہ ہو، جب کہ 'مکروہ تحریمی' وہ عمل کہلاتا ہے جس کا کرنا جائز نہ ہو) [ملاحظہ ہو: ردالمحتار، ابن عابدین شامیؒ، مطبوعہ: دارعالم الکتب، ریاض، ۲۵۸/۱]۔

فقہائے متقدمین کے یہاں خواتین کی مسجد حاضری کو 'مکروہ' قرار دینے سے مراد اس کو 'مکروہ تنزیہی' کہنا ہے 'مکروہِ تحریمی' قرار دینا نہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ متعدد متقدمین کے یہاں اس کو مکروہ قرار دینے کے ساتھ ساتھ اس کے جواز کی صراحت بھی ملتی ہے، اور جواز کا حکم 'مکروہ تنزیہی' کے ساتھ تو لگایا جاسکتا ہے 'مکروہ تحریمی' کے ساتھ نہیں، مثلا فتاویٰ عالمگیری میں امام سرخسی کی المحیط کے حوالے سے لکھا گیا ہے: ''وَلَو اعْتَكَفَتْ فِي مَسْجِدِ الْجَمَاعَةِ جَازَ وَيُكْرَه وَالأول أولى'' [الفتاویٰ الہندیۃ، ۲۱۱/۱، مطبوعہ: دارصادر بیروت] (باجماعت نماز جس مسجد میں ادا کی جاتی ہو وہاں خاتون کا اعتکاف کرنا جائز ومکروہ ہے، جب کہ پہلی صورت [یعنی گھر میں اعتکاف کرنا] زیادہ بہتر ہے)، فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین نے اس کے بعد جو تحریر کیا ہے وہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے: 'وَمَسْجِدُ حَيِّها أَفْضَلُ لَها مِنَ الْمَسْجِدِ الْاَعْظَم'' (خاتون کے لیے اپنے محلّہ کی مسجد میں اعتکاف کرنا بڑی مسجد میں اعتکاف کرنے سے افضل ہے)۔

فتاویٰ عالمگیری کے سلسلے میں اہل علم جانتے ہیں کہ وہ کسی ایک فقیہ کی رایوں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ اپنے وقت کے ممتاز ترین فقہائے احناف کی ایک جماعت کے ذریعہ مرتب کیا گیا فقہ حنفی کے مستند ومفتیٰ بہ اقوال کا مجموعہ ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب سے پونے چار سو برس قبل تک ممتاز فقہائے احناف کی اس جماعت کے نزدیک مفتیٰ بہ قول یہ تھا کہ خواتین کے لیے مسجد میں آنا جائز ہے، لیکن مکروہ بمعنیٰ خلافِ اولیٰ ہے۔ اس طرح دیکھیے تو مکروہ بتانے والے اقوال بھی درحقیقت جواز پر ہی دلالت کررہے ہیں۔

حالانکہ فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب وتدوین سے پہلے بھی بعض فقہائے احناف اس بات کے قائل تھے کہ فقہ حنفی میں خواتین کے لیے مسجد میں حاضری کو 'مکروہ' کہنے کا مطلب 'مکروہ تحریمی' قرار دینا ہے، مثلا امام عینیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ اس سلسلہ میں مکروہ سے مراد مکروہ تحریمی ہے، بالخصوص ہمارے زمانے میں کہ اہل زمانہ میں بہت بگاڑ آ گیا ہے، ''قَوْلُهُم يُكْرَه مُرادُهُم يُحَرَّم لا سِيَّما فِي هٰذا الزَّمانِ لِشُيُوعِ الْفَسَادِ فِي أَهْلِه'' [عمدۃ القاري، ۶۴۶/۴، مطبوعہ زکریا بکڈپو، دیوبند]۔

یہی مکروہ تحریمی والی رائے اب برصغیر کے احناف علما کے یہاں مقبول رائے ہے، اور اب فتویٰ اسی کے مطابق دیا جاتا ہے۔ گوکہ دنیا کے متعدد ممالک میں احناف علما وفقہا کی ایک تعداد مساجد میں خواتین کو حاضری سے نہیں روکتی، عراق ومصر جیسے ممالک جہاں احناف کی ایک بڑی تعداد آباد ہے وہاں حنفی خواتین مساجد حاضر ہوتی ہیں، اور انھیں وہاں کے احناف علما کی جانب سے نہیں روکا جاتا، اسی طرح ترکی کی سو

فیصد آبادی حنفی ہے، اور مساجد میں خواتین کی حاضری عام بات ہے۔

'مکروہ تحریمی' کے دلائل:

خواتین کی مسجد حاضری کو 'مکروہ تحریمی' یا ممنوع قرار دینے کے چند دلائل دیے جاتے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱-موجودہ زمانہ پرفتن ہے، فتنہ، فساد اور بے حیائی عام ہے، ایسی صورت میں خواتین کے مسجد آنے میں شدید فتنہ کا اندیشہ ہے، لہٰذا بطور 'سدِّ ذریعہ' خواتین کا مسجد آنا ممنوع ہے۔ 'سدِّ ذریعہ' ایک فقہی اصطلاح ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جو جائز کام کسی ناجائز امر کا سبب بنتا ہو اس کو بھی ممنوع قرار دیا جائے تاکہ اس کے نتیجہ میں وجود میں آنے والے ناجائز امر کو وجود میں آنے سے روکا جاسکے۔

۲-حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد فرمایا تھا: ''اگر رسول اللہ ﷺ آج کی خواتین کو دیکھ لیتے تو انھیں مسجد آنے سے روک دیتے'' [مسند احمد، مسند عائشہ: ۲۴۴۰۶]۔

۳-حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں خواتین کو مسجد آنے سے روک دیا تھا، اور اس پر گویا صحابہ کا اتفاق ہوگیا تھا۔

ان دلائل کا جائزہ:

خواتین کے لیے مسجد حاضری کو ممنوع قرار دینے کے یہی وہ دلائل ہیں جو اس سلسلہ کے فتاویٰ میں ہمیں مختلف الفاظ میں پڑھنے کو ملتے ہیں، ذیل میں ان دلائل کا طالبِ علمانہ جائزہ حاضر ہے:

- حضرت عمر کے ذریعہ خواتین کو مسجد میں آنے سے روکے جانے اور اس پر صحابہ کے اتفاق یا اجماع کے سلسلہ میں ہم نے پیچھے ''ایک غلط بات جو مشہور ہوگئی'' کے زیرعنوان جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ یہ دعویٰ بالکل بلا دلیل ہے، اس کے حق میں کوئی ایک دلیل بھی ہمارے مصادر ومراجع میں نہیں ہے، بلکہ کتبِ حدیث وتاریخ کی متعدد روایات اس دعوے کو غلط ثابت کرتی ہیں، پھر خلافت راشدہ اور اس کے بعد کی اب تک کی تاریخ میں عالم اسلام کی خواتین کی مسجد حاضری کا سلسلہ کبھی بھی منقطع نہیں ہوا ہے، اور آج تک جاری ہے، جس کی قدرے تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔

- حضرت عائشہؓ کے ارشاد کے سلسلے میں بھی ہم پیچھے یہ لکھ آئے ہیں کہ اگرچہ ان کا یہ احساس تھا، لیکن علمائے صحابہ کی اکثریت اس سلسلہ میں ان کی ہم رائے نہیں تھی، اسی لیے ہمیں عہد صحابہ میں خواتین کی مسجد حاضری کا تسلسل قائم ملتا ہے، اگر ان کی یہ رائے عام صحابۂ کرام کی رائے ہوتی تو ہرگز وہرگز خواتین کی مسجد حاضری یوں جاری نہ رہتی،..... اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ کا یہ ارشاد جس روایت میں نقل ہوا ہے اس سے ہمیں یہ تفصیل بھی معلوم نہیں ہو پاتی کہ یہ جملے انھوں نے کسی واقعہ پر وقتی تأثر کے نتیجے میں ارشاد فرمائے تھے یا یہ ان کا مستقل موقف تھا؟

- ممانعت کے سلسلے کی اصل دلیل وہی ہے جو ہم نے دلائل کی فہرست میں سب سے پہلے ذکر کی ہے، یعنی یہ کہ خواتین کی مسجد آمد سے فتنہ کا اندیشہ ہے، لہٰذا ان کو مسجد آنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

اس دلیل اور ان فتاویٰ میں اس سے کیے جانے والے استدلال پر غور کریں تو یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ خواتین کے لیے مسجد آنے کو ممنوع قرار دینے والے ان حضرات کے نزدیک بھی اصل حکم تو جواز کا ہی ہے، بس خوفِ فتنہ کے پیش نظر یہ حضرات اصل حکم میں تبدیلی کے قائل ہیں، حضرت عائشہؓ اور امام عینیؒ کا جو ارشاد ہم نے اوپر نقل کیا ہے اس سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ اور اسی لیے ہمارے

اصحابِ افتا کے یہاں اس مسئلہ کی بابت حکم بیان کرتے ہوئے زمانہ کی برائیوں کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔

● **فتنہ کا اندیشہ اور رسول اکرم ﷺ کا اسوہ:**

اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ جس فتنہ کے پیش نظر خواتین کے لیے مسجد حاضری کو ممنوع قرار دیا جاتا ہے اس کا خیال رسول اللہ ﷺ کو بھی تھا، لیکن آپ نے اس کے سلسلے میں کچھ اور راہِ عمل اختیار کی، آپ ﷺ نے اس کی بنا پر خواتین کو مسجد آنے سے روکا نہیں، بلکہ اس فتنہ کے اندیشہ کو کم سے کم تر کرنے کی تدابیر اختیار کیں، جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

۱- آپ ﷺ نے عورتوں کو حکم دیا کہ وہ مسجد حاضری کے وقت ان اسبابِ زینت سے مکمل اجتناب برتیں جو کسی نامحرم کے لیے باعثِ کشش ہوسکتے ہیں، اس سلسلہ میں حدیث کی کتابوں میں آپؐ کا ایک عجیب وغریب ارشاد نقل فرمایا گیا ہے، جس سے اس سلسلے میں صحیح راہِ عمل کی مکمل راہ نمائی ہوتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''مردوں! اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مساجد سے نہ روکو، البتہ وہ مسجد حاضری کے وقت اسبابِ زینت کو اختیار نہ کریں'' [ابوداؤد: کتاب الصلاۃ، باب ما جاء في خروج النساء الی المسجد، حدیث نمبر: ۵۶۵]، یعنی پرکشش کپڑوں اور خوشبو وغیرہ سے اجتناب کریں۔ اس ارشادِ نبوی پر غور کیجیے تو اس سے وہ راہِ عمل واضح طور پر سامنے آجاتی ہے جس کا ہم نے اوپر تذکرہ کیا، یعنی یہ کہ خواتین کی مسجد آمد پر پابندی لگائے جانے کے بجائے فتنہ کے امکانات کو کم سے کم کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔

۲- آپ ﷺ کے عہد میں چونکہ مرد اور عورتیں ایک ہی ہال میں نماز ادا کرتے تھے، اس لیے آپ نے یہ راہ نمائی کی کہ مرد مسجد کے اگلے حصہ سے اپنی صفیں بنانا شروع کریں، اور عورتیں پچھلے حصے سے، تاکہ اختلاط وفتنہ کے امکانات تقریباً معدوم ہوجائیں، ارشاد فرمایا: ''مردوں کے لیے بہترین صف اولین صف ہے، اور بدترین (یعنی سب سے کم فضیلت والی) آخری صف ہے، اور عورتوں کے لیے بہترین صف آخری صف ہے، اور بدترین (یعنی سب سے کم فضیلت والی) صف ان کی پہلی صف ہے'' [مسلم: کتاب الصلاۃ، باب تسویۃ الصفوف واقامتہا، حدیث نمبر: ۴۴۰]۔

۳- اسی حکمت (فتنہ کے اندیشہ کو کم سے کم کرنے) کے پیشِ نظر رسول اللہ (ﷺ) اس بات کا اہتمام فرماتے تھے کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد عورتیں مسجد سے جلد چلی جائیں، ان کے چلے جانے کے بعد ہی آپؐ اور مرد صحابہ مسجد سے باہر نکلتے تھے [بخاری: کتاب الاذان، باب انتظار الناس قیام الامام، حدیث نمبر: ۸۶۶، اور باب صلاۃ النساء خلف الرجال، حدیث نمبر: ۸۷۰]۔

۴- اپنی مسجد میں خواتین کے داخلہ کے لیے آپؐ نے ایک مستقل دروازہ مخصوص فرمادیا تھا، تاکہ مسجد میں داخل ہوتے وقت اور نکلتے وقت مردوں اور عورتوں کے اختلاط سے فتنہ نہ پیدا ہو، [ابوداؤد: کتاب الصلاۃ، باب التشدید في ذلک، حدیث نمبر: ۵۷۱]۔

اس طرح آں حضرت (ﷺ) کا جو اسوہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ مرد وزن کے اختلاط یا ایک جگہ جمع ہونے سے جس فتنہ کا اندیشہ محسوس ہوتا ہے اس کی بنا پر خواتین کے لیے مسجد آنے کو ممنوع قرار نہ دیا جائے، بلکہ اس فتنہ کے امکانات کو کم سے کم تر کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔

اسی اسوہ پر عمل کرتے ہوئے آپؐ کے بعد جب حالات مزید احتیاط کے متقاضی ہوئے تو مزید احتیاطی تدابیر اختیار کی گئیں، مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک طریقہ یہ

اختیار کیا کہ وہ خواتین کی اگلی صف میں عمر رسیدہ خواتین کو کھڑا کرواتے، اور جواں عمر خواتین کو یہ حکم دیتے کہ وہ خواتین کی پچھلی صف میں کھڑی ہوں[مصنف ابن ابی شیبہ: کتاب الصلاۃ، باب من قال خیر صفوف النساء آخرھا، حدیث نمبر: ۷۷۰۹]۔

موجودہ عالم اسلام کی لاکھوں مساجد میں اسی طرح کی مزید احتیاطی تدبیر یہ اختیار کی گئی کہ خواتین کے لیے مساجد میں مردوں سے الگ ہال کا انتظام کیا گیا، جس کا راستہ بھی الگ ہوتا ہے، اور اس طرح فتنہ کے اندیشہ کو مزید کم کر دیا گیا۔

● **کیا فتنہ کا اندیشہ اتنا ہی شدید ہے؟:**

خواتین کی مسجد حاضری کو ممنوع قرار دینے والے ہمارے مؤقر اصحابِ افتا کے فتاویٰ میں 'فتنہ' کے نہایت شدید اندیشہ کا اظہار کیا جاتا ہے، اور اسی کو ممانعت کی بنیاد بنایا جاتا ہے، جس کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر مسلم خواتین کو مساجد آنے کی اجازت دی گئی تو مساجد کے راستوں اور دروازوں پر نہایت ناپسندیدہ صورت حال پیش آجائے گی، فتنہ کا یہ اندیشہ کیا واقعی اتنا ہی شدید ہے جتنا ان فتووں میں ظاہر کیا جاتا ہے؟ ذیل کی چند سطروں میں اسی سوال کا صحیح جواب جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہمارے ملک میں سیکڑوں بلکہ شاید ہزاروں مساجد میں خواتین حاضر ہوتی ہیں، پورے عالم میں ایسی بلا مبالغہ لاکھوں مساجد ہوں گی لیکن وہاں اس طرح کا فتنہ نظر نہیں آتا، چند نہایت شاذ و نادر قسم کے واقعات شاید اس طرح کے پائے گئے ہوں، لیکن جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ان کی حیثیت نہایت شاذ و نادر کی ہوگی، جن پر کسی حکم کا مدار نہیں رکھا جاسکتا ہے۔

گزشتہ چند دہائیوں میں ہمارے یہاں طالبات کے مدارس بڑی تعداد میں قائم ہوئے ہیں، جن میں بلا مبالغہ روزانہ لاکھوں طالبات تعلیم حاصل کرتی ہیں، اور ہزاروں مدرسات پڑھاتی ہیں، لیکن اس قدر شدید فتنہ کہیں نظر نہیں آتا۔

دینی جلسوں، بیانات اور دروس قرآن جیسی مجلسوں میں 'خواتین کے لیے پردہ کے معقول انتظام' کا حوالہ دے کر خواتین کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے، اور وہ اپنے گھروں سے چل کر متعینہ مقامات تک آتی بھی ہیں، لیکن فتنہ کی یہ شدت کہیں نظر نہیں آتی۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ فتنہ کی جس 'شدید نوعیت' کی بنیاد پر خواتین کی مسجد حاضری کو ممنوع قرار دیا جاتا ہے وہ ہمیں حقیقتِ واقعہ میں کہیں نظر نہیں آتی، بلکہ ایک موہوم شے محسوس ہوتی ہے۔

● **ہمارے عہد کی خواتین:**

ممانعت کے متعدد معاصر فتاویٰ میں یہ بات بھی مختلف الفاظ میں کہی گئی ہے کہ مسلم خواتین کو مسجد کے عنوان پر گھروں کے محفوظ ماحول سے باہر نکالنا کسی صورت صحیح نہیں ہے، اس طرح کی عبارتیں یقیناً نہایت حیرت ناک ہیں، ہمارے عہد کی خواتین کیا گھروں کی چار دیواری میں ہی رہتی ہیں، اور اس سے باہر نہیں نکلتی ہیں؟ کہ یہ خدشہ ظاہر کیا جائے کہ اگر مسجد آنے کی اجازت دی گئی تو اس کے نتیجے میں خانہ نشیں مسلم خواتین کا گھر سے باہر نکلنا لازم آئے گا، اور اس طرح ایک غلط نئی بات وجود میں آئے گی۔

صورت حال یہ ہے کہ مسلم معاشرہ کے تقریباً تمام ذی شعور گھرانوں کی لڑکیاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے روزانہ مدارس، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیز کا رخ کرتی ہیں، اور ہمارے اکثر علما اس کی ترغیب دیتے ہیں، بہت بڑی تعداد میں مسلم خواتین بازار جاتی ہیں، اعزہ واقربا کے گھر جاتی ہیں، روزانہ صرف ہمارے ملک میں بلا مبالغہ لاکھوں مسلم خواتین ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کا سفر کرتی ہیں، نہ جانے یہ کن

خواتین کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ وہ گھر کے اندر ہی رہتی ہیں ،انھیں مسجد آنے کی اجازت دے کر باہر نہ نکالا جائے۔

.....پھر خواتین مسجد کیوں آئیں؟:

اس موضوع پر غور وفکر کرتے وقت ایک سوال فطری طور پر ذہن میں آتا ہے،اور وہ یہ ہے کہ: متعدد احادیث میں آں حضرت ﷺ نے یہ بات فرمائی ہے کہ خواتین کے لیے گھر میں نماز ادا کرنا بہتر ہے،تو پھر خواتین مسجد کیوں آئیں؟

ہم نے جیسا کہ اوپر لکھا یہ ایک بالکل فطری سوال ہے جو اس مسئلہ پر غور وفکر کرتے وقت ذہن میں آتا ہے،لیکن اس سوال کا جواب رسول اللہ ﷺ کے ہی طرزِ عمل اور اسوہ میں پنہاں ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ اگر چہ آپؐ نے خواتین کے لیے گھر کی نماز کو زیادہ افضل بتایا تھا،لیکن آپؐ کی مسجد میں صحابیات حاضر ہوتی تھیں، پیچھے یہ بات بھی گزر چکی ہے کہ ان صحابیات کی تعداد کم نہیں ہوتی تھی، بلکہ مسجد نبوی میں بظاہر کئی صفیں ان کی ہوتی تھیں،یہی نہیں کہ آپ ﷺ ان کے مسجد آنے پر کسی طرح کی نکیر نہیں فرماتے تھے، بلکہ مسجد میں ان کی آمد کے پیشِ نظر متعدد امور کا اہتمام فرماتے تھے،جن کا تذکرہ اوپر 'فتنہ کا اندیشہ اور رسول اکرم ﷺ کا اسوہ' کے زیرعنوان گزر چکا ہے،اسی کے ساتھ آپؐ نے مردوں کو واضح الفاظ میں یہ ہدایت بھی فرمائی تھی کہ وہ اپنے گھروں کی خواتین کو مسجد آنے سے نہ روکیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خواتین کے لیے گھر میں نماز کو افضل بتائے جانے کے باوجود عام خواتین نہیں صحابیات مسجد کیوں آتی تھیں،آپؐ ان کو منع کیوں نہیں فرماتے تھے، بلکہ مردوں سے کیوں یہ کہتے تھے کہ اپنے گھروں کی خواتین کو مسجد آنے سے نہ روکو؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسجد صرف عبادت گاہ نہیں ہے، بلکہ وہ ایک بہترین تعلیم گاہ، تربیت کدہ اور دعوتی مرکز ہے، اس میں نہ آنا اصلاح، تعلیم وتربیت کے بے بدل نظام سے محرومی ہے، ہمارے آج کے اس گئے گزرے دور میں بھی مسجدیں اپنا یہ کردار ادا کرتی ہیں،آپ کو مسجد میں جتنے حضرات نماز کے پابند نظر آتے ہیں ان سے دریافت کیجیے کہ نماز اور دیگر دینی احکام کی پابندی کا یہ ذوق ان کے اندر کہاں سے پیدا ہوا؟ اور دین داری کا یہ رجحان ان کے اندر کیسے پنپا؟ ان کی اکثریت کا جواب آپ کو مسجد کے اس کردار کا پتہ دے گا، وہ مسجد کے ماحول اور اس میں ہونے والے بیانات کا تذکرہ کریں گے، نہ جانے کتنے ایسے لوگ ہیں جو بے نمازی تھے،کوئی خاص دینی رجحان نہیں رکھتے تھے،بس جمعہ پڑھ لیتے تھے،مسجد میں ہونے والے کسی وعظ یا خطاب کو سنا، جس نے ان کو ہلا کر رکھ دیا، اور ان کی زندگی کا رخ بدل گیا، اب وہ ایک پابندِ شریعت مسلمان ہیں، یہی وجہ ہے کہ جن بستیوں اور آبادیوں میں مسجد ہوتی ہے ان کے افراد کا دینی حال ان مسلمانوں سے کہیں زیادہ بہتر ہوتا ہے جن کی بستی میں مسجد نہیں ہوتی۔

ہم جب معاشرے کے کسی بھی حصے کے لیے مسجد کے دروازے بند کرتے ہیں اُس کو مسجد کے اِس خیرِ عظیم سے محروم کردیتے ہیں،اور یہی اس وقت خواتین کے ساتھ ہو رہا ہے،ہم اس موقع پر صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں، یہ ایسی مثال ہے جس کا مشاہدہ غالبا قارئین میں سے ہر ایک نے اپنے گردوپیش میں ضرور کیا ہوگا۔

گزشتہ دو تین دہائیوں سے ہمارے علما اور واعظین شادیوں کی بے جا رسموں کے خلاف تقریریں کرنے کا خاص اہتمام کر رہے ہیں، جمعہ کی نماز سے پہلے ہونے والے بیانات

میں بار بار لوگوں کو جہیز اور شادی کے موقع پر ہونے والی خرافات سے روکا جاتا ہے، اب اس کا نتیجہ بھی نظر آنے لگا ہے، کچھ شادیاں ان غلط رسموں اور بے جا رسموں سے پاک ہونے لگی ہیں، اور ایسی شادیوں کی تعداد میں الحمدللہ مسلسل اضافہ ہی ہو رہا ہے، لیکن مسلم معاشرہ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ مردوں بالخصوص نوجوانوں کی ایک تعداد سادہ شادیاں کرنا چاہتی ہے، اور انھیں بالعموم گھر کی خواتین کی جانب سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، آخر اس کا سبب کیا ہے؟ ان نوجوانوں کے اندر شادیوں کے موقع کی بے جا رسموں کو ترک کرنے کا جذبہ کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ اور بالعموم خواتین کے اندر یہ کیوں نہیں پیدا ہو پاتا؟ درحقیقت ہمارے مردوں نے مساجد ہی میں ہونے والے خطابات میں بار بار اس موضوع پر دینی گفتگو سنی ہوتی ہے جس میں ان کو سادہ اور سنت کے مطابق شادیاں کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اس لیے ان کے اندر یہ اچھا جذبہ پیدا ہوتا ہے، لیکن چونکہ ہماری خواتین ان خطابات میں حاضر نہیں ہوتیں اس لیے ان کے اندر یہ مبارک جذبہ بالعموم پیدا نہیں ہوتا، اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کو اس موقع پر گھر کی خواتین سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یہ تو ایک مثال ہے، ورنہ مسجد کے اس 'خیر' سے خواتین کی محرومی کے متعدد نتائج ہماری نظروں کے سامنے ہیں، تقریبا ہر مسجد کے گرد وپیش میں آباد نوجوانوں کی ایک تعداد میں دینی اعتبار سے بڑی مبارک تبدیلی آتی ہے، ہمارا اپنا خود کا مشاہدہ ہے کہ اس تبدیلی کا تناسب نوجوان لڑکیوں میں نوجوان لڑکوں سے کہیں کم ہے، وجہ یہی ہے کہ نوجوان مردوں میں آنے والی اس تبدیلی میں بہت بڑا کردار مسجد کا ہوتا ہے، جب کہ صنفِ مخالف مسجد کے اس فیض سے محروم رہتی ہے۔

مسجد کے اس 'خیر' سے استفادہ مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے کتنا ضروری اور مفید ہے اس کا اندازہ رسول اکرم ﷺ کی ایک ہدایت سے ہوتا ہے، عید کی نمازوں میں خواتین کی شرکت کا حکم آپ ﷺ بہت تاکید کے ساتھ دیتے تھے، ایک صحابیہ نے غالبا اسی تاکید کی وجہ سے دریافت کیا کہ اگر کسی خاتون کے پاس جلباب (اوڑھنی) نہ ہو اور اس وجہ سے وہ عید کی نماز میں شرکت نہ کرے تو اس پر کوئی گناہ تو نہ ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: کوئی دوسری خاتون اسے جلباب دے دے، اور وہ اس موقع کے 'خیر' اور مسلمانوں کی دعا میں شریک ہو [بخاری: کتاب العیدین، باب اذا لم یکن لہا جلباب في العید، ۳۲۴]۔ بعض محدثین وشراح نے تشریح کی ہے کہ اس حدیث میں 'خیر' سے مراد عید کے موقع پر کیا جانے والا خطاب ہی ہے [مثلا ملاحظہ ہو: حاشیۃ السندي علی سنن النسائی، حدیث: ۳۹۰]۔

اس 'خیر' کو آپ ﷺ خواتین کے لیے بھی کتنا لازمی وضروری جانتے تھے اس کا اندازہ اس سے کریے کہ ایک مرتبہ عید کے موقع پر خطاب فرمانے کے بعد آپ بطور خاص وہاں موجود خواتین کے پاس گئے اور ان کو مزید وعظ فرمایا۔ [بخاری: کتاب التفسیر، سورۃ الممتحنۃ، حدیث: ۴۸۹۵]

اس پوری بات کو ہم یوں بھی سمجھ اور کہہ سکتے ہیں کہ ہر مسلمان مرد وعورت کے دینی حال میں بہتری وترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ کچھ وقت وہ خالص دینی ماحول میں گزارے، اور یہ ہماری ہی ضرورت نہیں ہے حضراتِ صحابۂ کرام بھی اس کی ضرورت محسوس فرماتے تھے، حضرت معاذ بن جبل جیسے جلیل القدر صحابی بھی اپنے ایک ساتھی سے کہا کرتے تھے: آؤ بیٹھو تھوڑی دیر اپنا ایمان تازہ کریں [مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الایمان والرؤیا، باب، ۳۱۰۰۲]، یہ حضرت معاذ بن جبل ہیں، عظیم ترین علمائے صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے، رسول اکرم ﷺ

کے نہایت معتمد ہیں، اور وہ بھی اس کی ضرورت محسوس فرمارہے ہیں کہ وہ دوسروں کے ساتھ ایک دینی مجلس منعقد کریں جس میں ایمان تازہ کرنے والی باتیں ہوں اور اس طرح وہ اپنی ایمانی کیفیت میں بہتری لائیں، معروف تابعی امام حضرت علقمہ بھی اپنے شاگردوں سے کہتے: آؤ چلو، اپنی ایمانی کیفیت میں اضافہ کریں [مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الایمان والرؤیا، باب، ۳۰۹۹۹] جب ان حضرات صحابہ وتابعین کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ وہ کچھ دیر اپنے عام ماحول سے الگ خالص دینی ماحول میں گزاریں تو ہم جیسوں کے ایمانی حال کو اس کی کس قدر ضرورت ہوگی۔

امت کی غالب ترین اکثریت کے لیے مسجد ہی وہ جگہ ہے جہاں جا کر وہ دینی ماحول میں کچھ وقت گزار سکے، کوئی اور جگہ یا مقام اس کا متبادل نہیں ہے، جو افراد مسجد نہیں آتے وہ اس خیرِ کثیر سے محروم رہتے ہیں، ایسے لوگ مسجد نہ آکر صرف جماعت سے نماز کی ادائیگی کی فضیلت سے ہی محروم نہیں رہتے، ایمانی ماحول اور اس کی برکتوں سے بھی محروم رہتے ہیں۔..... اس ایمانی ماحول اور اس کی برکتوں کی ضرورت صرف مردوں کو نہیں، عورتوں کو بھی ہے۔

بعض برادران کہتے ہیں کہ خواتین کے لیے مسجد کے علاوہ بھی تو کہیں ایسی مجلسیں منعقد ہوسکتی ہیں، جیسے محلّہ کے کسی گھر میں یا کسی اور جگہ، اس کے لیے مسجد ہی کی کیا ضرورت ہے؟

ایسے برادران سے عرض ہے کہ:

۱- جس طرح مردوں کے لیے کوئی اور مقام مسجد کا کامیاب وعملی طور پر آسان متبادل نہیں ہوسکتا اسی طرح خواتین کے لیے بھی نہیں ہوسکتا، تجربہ اس کا شاہد ہے۔

۲- کیا آپ کو جس فتنہ کا ڈر مسجد میں خواتین کی آمد سے لگ رہا ہے، وہ کسی اور مقام پر جانے سے مانع نہ ہوگا، یہ کیسا فتنہ ہے جو مدارس واسکولوں میں جانے سے مانع نہیں ہوتا، کسی پڑوسی کے گھر میں جانے سے نہیں روکتا، کسی دینی جلسہ اور درس کے حلقہ سے باز نہیں رکھتا، بس مسجد کا نام آتے ہی ہمیں اس کی موہوم شدید نوعیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔

پھر تعلیم گاہوں سے لے کر ٹیلی ویزن اور موبائل تک کے تمام وسائل شرک کی تبلیغ کے ذرائع بنے ہوئے ہیں، عصری تعلیم کے تقریباً تمام اداروں کا نصاب دیومالائی تہذیب کا ترجمان ہے، ذرائع ابلاغ روز وشب شرک کی تبلیغ کرتے ہیں، اسلامی عقائد واحکام کے خلاف مہم چلاتے ہیں، زمانہ کا ماحول آخرت سے غافل اور زینتِ دنیا کا اسیر کرنے والا ہے، حیاسوز مغربی تہذیب کا ہر سو بول بالا ہے، اس میں پروان چڑھ رہی موجودہ نسل (کے مرد وزن) کے لیے اس زہر کا تریاق کہیں ہے تو وہ مسجد ہے، اور اسے وہیں سے محروم کردینا کس قدر خطرناک ہے اس کا اندازہ ہر وہ شخص کرسکتا ہے جس کو زمانہ کے چیلنجس کا ادراک ہو۔

اس پوری تفصیل سے امید ہے کہ یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ خواتین کی مسجد حاضری کی ضرورت کیا ہے؟ اور ان کے مسجد نہ آنے سے کیا نقصان ہے؟

ہاں البتہ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ خواتین کی مسجد آمد کے سلسلے میں اس طرح کی احتیاطی تدابیر بھی ہمیں اختیار کرنی چاہییں جن کا تذکرہ ہم نے 'فتنہ کا اندیشہ اور رسول اکرم ﷺ کا اسوہ' کے زیرعنوان کیا ہے۔

حاصلِ مطالعہ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا اس کا حاصل آخر میں عرض کردیا جائے۔

- مسجد صرف عبادت گاہ نہیں ہے، بلکہ وہ ایک

- بہترین تعلیم گاہ، تربیت کدہ اور دعوتی مرکز ہے، اس میں نہ آنا اصلاح، تعلیم وتربیت کے بے بدل نظام سے محرومی ہے۔
- رسول اللہ ﷺ کی مسجد مدنی معاشرہ کی پوری دینی زندگی کا محور تھی، جہاں آپؐ کی موجودگی اور آپؐ کی عدم موجودگی میں مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا کام ہوتا تھا۔
- آپؐ کی مسجد میں خواتین بھی بڑی تعداد میں حاضر ہوتی تھیں، وہ باجماعت نمازوں میں شرکت کرتیں، خطبات سنتیں، اور مجالسِ وعظ وارشاد سے مستفید ہوتیں۔
- آپؐ کی حیات میں بعض حضرات کو خواتین کی مسجد آمد کے سلسلے میں تردد تھا، لیکن آپؐ نے ان کو واضح حکم دیا کہ وہ اپنی خواتین کو مسجد آنے سے نہ روکیں۔
- خواتین کی مسجد آمد کا سلسلہ عہد نبوی کے بعد بھی جاری رہا، یہ سلسلہ آج تک عالمِ اسلام کے اکثر حصہ میں جاری ہے۔ حضرت عمرؓ کی جانب سے اس کو ممنوع قرار دیے جانے کی جو بات ہمارے یہاں شہرت پا گئی ہے بے دلیل وبے بنیاد ہے۔
- دیگر فقہا کی مانند متقدم فقہائے احناف بھی اس کو جائز مانتے تھے۔
- آج بھی ترکی، مصر وعراق جیسے ممالک میں علمائے احناف خواتین کو مسجد آنے سے نہیں روکتے۔
- ہمارے اصحابِ افتا خواتین کے لیے مسجد حاضری کو ممنوع (مکروہِ تحریمی) قرار دیتے ہیں، اس فتوے کی بنیاد صرف 'فتنہ کا اندیشہ' ہے۔

اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا اسوہ یہ ہے کہ 'فتنہ کے اندیشہ' کے پیش نظر خواتین کی مسجد آمد کو ممنوع قرار نہ دیا جائے، بلکہ اس فتنہ کے امکانات کو کم سے کمتر کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس اسوہ پر عمل کرتے ہوئے عالمِ اسلام کے اکثر ممالک میں ایک زمانہ سے خواتین کے لیے مسجدوں میں الگ ہال اور الگ دروازے کا اہتمام کیا گیا ہے، اور یہ تدبیر کافی ثابت ہوئی ہے، فتنہ کی جس 'شدید نوعیت' کو بنیاد بنا کر خواتین کے لیے مسجد حاضری کو ممنوع قرار دیا جاتا ہے وہ ان مساجد میں ہمیں کہیں نظر نہیں آتی، اور اس طرح ایک بے حقیقت وموہوم شے ثابت ہوتی ہے، جس کو حکم کا مدار بنانا کسی صورت صحیح نہیں ہوسکتا۔

مردوں کی طرح خواتین کی عمومی دینی اصلاح کے لیے بھی مسجد کا وجود اور وہاں ان کی حاضری لازمی وضروری ہے، اس کا کوئی قابلِ عمل متبادل نہیں ہے۔

☆☆☆

❑ تحقیق و تنقید

قسط:۱

اہل کتاب اور مسئلۂ کفر وایمان

مولانا محمد غزالی ندویؒ

نوٹ: ''**اہلِ کتاب اور مسئلۂ کفر وایمان**''، مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کے سابق استاد اور امام بخاری ریسرچ اکیڈمی علی گڑھ کے بانی مولانا محمد غزالی ندویؒ کی ایک معرکۃ الآرا کتاب ہے، جس میں انھوں نے اس مسئلے پر دلائل کی روشنی میں سیر حاصل بحث کی ہے کہ اہل کتاب، آخری نبی محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے بغیر، مومن اور نجات کے مستحق نہیں ہوسکتے۔ان کی یہ کتاب تحقیق وتنقید کے اعلی معیار پر پوری اترتی ہے۔مصنف نے اصل اور اساسی مصادر سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔اس کی زبان اور اسلوبِ بیان بھی نہایت شگفتہ اور ادبی ہے۔افادۂ عام کی غرض سے اس کے مضامین قسط وار قارئین کی خدمت میں پیش کیے جاتے رہیں گے۔ (ادارہ)

یہود و نصاری کا اسلام اور ایمان سے خارج ہونا مسلمانوں کے یہاں ایسی بدیہی اور مسلم بات ہے، جس میں کسی بحث وتحقیق اور تحریر وتالیف کی گنجائش نہیں۔اس طرح کی کسی کوشش کی مثال ایسی ہی ہے جیسے انسانوں کے بارے میں ایک کتاب تالیف کی جائے، جس میں یہ ثابت کیا جائے کہ وہ ذی روح ہیں، بات کرتے ہیں اور غذا استعمال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں بالکل بدیہی اور مسلم ہیں، اور ان امور پر گفتگو کرنا ضیاع وقت کے سوا اور کچھ نہیں؛ لیکن کیا کیجیے کہ مغربی سامراج کے تسلط، مغربی اقوام کی بالادستی اور ان کی تہذیب کے عروج کے بعد جس دور میں ہم جی رہے ہیں، اس میں دوسرے بہت سے مسلمات کی طرح اہل کتاب کے کفر پر بھی شبہات قائم کرنے اور اسے مختلف فیہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، جس کی وجہ سے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کرنے کی شدید ضرورت پیدا ہوگئی ہے۔

مسلمانوں پر مغربی سامراج کے اثرات

اسلامی ملکوں پر مغربی سامراج کے تسلط سے مسلمانوں کو دوہرا نقصان پہنچا ہے۔ایک طرف ان کے ممالک اجنبی طاقتوں کے تصرف میں آگئے۔ان کی عظمت رفتہ قصہ پارینہ بن گئی۔ذلت، شکست خوردگی، مایوسی، تعلیمی پسماندگی، فکری انحطاط، چاپلوسی اور وہ تمام صفات ان میں پیدا ہوگئیں جو ظالم وجابر فاتحین کی مفتوحہ اقوام میں پیدا ہوجاتی ہیں۔

دوسرا نقصان مذہبی ہوا، جو پہلے نقصان سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا تھا۔بہت سے مسلمان کچھ فاتح قوم کی مرعوبیت اور کچھ غیر ملکی آقاؤں کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے اسلامی عقائد واحکام کو مغربی تہذیب کے مطابق ڈھالنے اور اس سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔خود فاتح قوم کا یہ حال تھا کہ ماضی کے فاتحین کے برعکس اس نے اپنی مفتوحہ قوموں کو عسکری، تہذیبی، علمی اور مذہبی ہر محاذ پر شکست دے دینے کا عزم کر رکھا تھا۔مذہبی محاذ پر مسلمانوں کو زیر کرنے کے

لیے ان کے بے شمار اسکالرز مختلف یونیورسٹیز میں اسلامی علوم میں داد تحقیق دے رہے تھے۔ وہ ایک طرف قرآن وحدیث اور اسلامی تاریخ کے بہت سے مسلمہ حقائق کو اپنی ملمع سازیوں سے بے اصل ثابت کرنے پر تُلے تھے، اور دوسری طرف ان کے ظاہری علمی اسلوب اور جدید تحقیقات کا جادو اس قدر سر چڑھ کر بول رہا تھا کہ مسلمان قوم کے بہت سے افراد علوم اسلامیہ میں انھی کو سند اور مرجع سمجھنے لگے تھے، اور بے تکلف ان سے استفادہ کررہے تھے۔ اس غرض سے اگر انھیں یورپ کا سفر کرنا پڑتا، تو اس کو بھی بہ شوق گوارا کرتے۔ نتیجہ ظاہر تھا، مسلم معاشرے میں فکری انتشار جنم لینے لگا۔

مسلمانوں کی مذہبی بنیادیں متزلزل ہوگئیں۔ ان کی تہذیبی شناخت کے ایک ایک جز کو غیروں اور خود اپنوں کے ذریعے بے فائدہ اور عہد قدیم کی باقیات بتایا جانے لگا۔ وہ مسلمہ عقائد جو صدیوں سے بغیر کسی رد وقدح کے اسلامی عقیدہ کا جز تھے، انھیں نام نہاد تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر مسترد کیا جانے لگا۔ منجملہ ان کے یہ عقیدہ بھی تھا کہ موجودہ یہود ونصاری اسلام میں داخل نہیں ہیں۔

اہل کتاب کا کافر ہونا مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے:

اہل کتاب کے لیے حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانا اور آپ کی اتباع کرنا ضروری ہے، اس کے بغیر وہ نہ خدا کے فرمان بردار یعنی مسلم کہلانے کے مستحق ہیں اور نہ ہی مؤمن یعنی ایمان والے قرار پا سکتے ہیں۔ یہ ایسا عقیدہ ہے جس پر امت مسلمہ کے تمام افراد ہمیشہ متفق رہے ہیں، اور ماضی میں صرف بعض غالی صوفیہ، گمراہ فرقہ باطنیہ قرامطہ اور ملحد فلاسفہ نے اور دور حاضر میں صرف بعض متجددین نے اس کی مخالفت کی ہے۔ جس کے اسباب ہم پانچویں فصل میں ان شاء اللہ تفصیل سے ذکر کریں گے۔

قرامطہ، اتحادیہ اور فلاسفہ اپنے منحرف افکار کی وجہ سے مسلم معاشرے میں چوں کہ ایک خارجی عنصر کی حیثیت رکھتے تھے، اس لیے ان کی دوسری تمام آرا کی طرح یہ رائے بھی اعتبار حاصل نہ کرسکی۔ امت کے اجتماعی ضمیر نے اسے کبھی قبول نہ کیا، اور وہ تاریخ کے کباڑ خانے کی نذر ہوگئی۔

انیسویں صدی میں اس فکر نے ایک بار پھر اس وقت سر اٹھایا جب استعماری طاقتوں نے عالم اسلام پر تسلط حاصل کر لیا اور عسکری میدان میں مسلمانوں کو شکست دینے اور ان کی اقتصادیات پر قبضہ کرنے کے بعد ان کی تہذیبی اور مذہبی خصوصیات کو ختم کرنے اور انھیں اپنی تہذیب میں مکمل رنگ دینے کی کوشش کی۔ فکری اور تہذیبی میدانوں میں ان کے لیے مسلمانوں کو زیر کرنا آسان نہ تھا؛ اس لیے کہ مسلمان مذہبی عقائد کی رو سے یہود ونصاری کو بے راہ سمجھتے تھے؛ لیکن قسمت سے استعمار کو ایسے افراد میسر آ گئے جو اثر انگیزی، صلاحیت اور قومی جوش وجذبے میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ وہ استعماری طاقت اور مغربی تہذیب کی چکا چوند سے مبہوت ہونے کی وجہ سے مسلم سماج کے مسائل کا حل یہی سمجھتے تھے کہ وہ مغرب کے نقش قدم پر چلنے لگے۔ ایجادات واختراعات اور طاقت وقوت کے اسباب ووسائل اختیار کرنے میں اگر عالم اسلام کو مغرب کی تقلید کی دعوت دی جاتی، تو یہ بالکل درست بات تھی؛ لیکن مفتوحانہ احساس کمتری کی وجہ سے یہ حضرات مغربی تہذیب اور اس کے لادینی نظریات کو بھی عالم اسلام کے مشکلات کا مداوا سمجھتے تھے، حتی کہ ان اسلامی عقائد کی بھی تاویل اور تحریف معنوی کی کوشش کرتے تھے جنھیں مغربی عقل ماننے سے انکار کرتی ہے۔ جب مغرب اور اہل مغرب کا اثر ذہن ودماغ پر اس درجہ قائم ہو جائے، تو اس کا آخری زینہ یہی ہونا چاہیے تھا، اور یہی ہوا کہ انھوں نے اہل مغرب یعنی یہود ونصاری کو

برحق، ایمانی طائفے اور امت مسلمہ کا رکن قرار دے دیا؛ تاکہ مغربی افکار ونظریات اور مغربی تہذیب اختیار کرنے میں جو آخری حجاب ہے وہ بھی ختم ہو جائے۔ تب سے آج تک کچھ لوگ عالم اسلام میں اس فکر کے علم بردار رہے ہیں۔ ان لوگوں کو استعمار کا آلۂ کار تو نہیں کہا جاسکتا، ہاں کوئی فرد واحد ان میں سے ایسا ہو، یا رہا ہو تو اس کا علم اللہ کو ہے؛ لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ لوگ یورپ، اس کی تہذیب اور اس کے نظریات سے بے حد متاثر اور مرعوب رہے ہیں، اور انھوں نے خواہی نہ خواہی وہی کیا ہے جو استعمار کو مطلوب تھا۔

ان حضرات نے قرآن وحدیث سے دور از کار تاویلات کر کے یہود ونصاریٰ کو اہل ایمان ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے بعض نے کہا کہ قرآن کے اصل مخاطب اور اس کی اتباع کے مکلّف عرب ہیں نہ کہ یہود ونصاریٰ؛ اس لیے اگر وہ قرآن کی اتباع نہیں کرتے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اور اس سے ان کے اسلام اور ایمان پر کوئی فرق نہیں پڑتا؛ لیکن یہ واضح طور پر ایک غلط بات تھی۔ قرآن کی بے شمار آیات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اور بعض آیات میں خاص طور پر اہل کتاب کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ اس رسول اور قرآن کے مخاطب تم بھی ہو۔ سورۂ مائدہ میں کہا گیا:

﴿یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَكُمْ كَثِیْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَیَعْفُوْا عَنْ كَثِیْرٍ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِیْنٌ یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ............

”اے اہل کتاب! تمھارے پاس ہمارا رسول وہ بہت سی باتیں ظاہر کرتا ہوا آ گیا ہے جو تم کتاب کی چھپاتے رہے ہو۔ اور وہ بہت سی باتیں نظر انداز بھی کر رہا ہے۔ اب تمھارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور ایک واضح کرنے والی کتاب آ گئی۔ اس کے ذریعے سے اللہ ان لوگوں کو جو اس کی خوش نودی کے طالب ہیں سلامتی کی راہیں دکھا رہا ہے۔......

...... وَیُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَیَهْدِیْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾

[المائدۃ: ۱۵–۱۶].

...... اور اپنی توفیق بخشی سے ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لا رہا ہے۔ اور ایک صراطِ مستقیم کی طرف ان کی رہنمائی کر رہا ہے“۔

اسی طرح بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن تمام اہل کتاب کو ایک خانے میں نہیں رکھتا ہے؛ بلکہ قرآنی نظریے کے مطابق اہل کتاب میں بعض اچھے ہوتے ہیں اور بعض برے۔ بعض مومن ہوتے ہیں اور بعض کافر۔ یہ محض ایک مغالطہ ہے۔ اس سے کس کو انکار ہے کہ اہل کتاب میں بعض مومن ہیں اور بعض کافر۔ بعض اچھے ہیں اور بعض برے؛ لیکن مومن اور اچھے وہی ہیں جو محمد ﷺ پر ایمان لا کر آپ کی اتباع کر لیں۔ (۱)

اس مضمون پر بہت سی آیتیں دلالت کرتی ہیں جنھیں ہم اس کتاب میں جستہ جستہ پیش کریں گے؛ لیکن یہاں صرف دو آیتیں پیش کرتے ہیں۔ پہلی آیت میں اچھے اہل کتاب کی صفت بیان کی گئی ہے اور دوسری آیت میں برے اہل کتاب کی۔

پہلی آیت

﴿اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ

عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِهٖ وَعَزَّرُوۡهُ وَنَصَرُوۡهُ وَاتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴾ [الأعراف:۱۵۷].

''جو پیروی کریں گے اس نبی امی رسول کی جسے وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ جو ان کو بھلائی کی تلقین کرے گا۔ اور ان کو برائی سے روکے گا۔ اور ان کے لیے پاک چیزیں حلال کرے گا اور گندی چیزیں ان پر حرام کرے گا۔ اور ان پر سے ان کے بوجھ کو اور ان پر لدی ہوئی بیڑیوں کو اتارے گا۔ بس جو اس کو مانیں گے اور اس کا ساتھ دیں گے اور اس کی مدد کریں گے اور اس نور کی پیروی کریں گے جو اس کے ساتھ اترا، تو وہی مراد کو پہنچیں گے''۔

دوسری آیت

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ اٰمِنُوۡا بِمَا نَزَّلۡنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّطۡمِسَ وُجُوۡهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤی اَدۡبَارِهَاۤ اَوۡ نَلۡعَنَهُمۡ کَمَا لَعَنَّاۤ اَصۡحٰبَ السَّبۡتِ وَکَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ مَفۡعُوۡلًا﴾ [النساء:٤٧].

''اے وہ لوگو! جن کو کتاب دی جا چکی ہے اس چیز پر ایمان لے آؤ جسے ہم نے اتارا، جب کہ وہ اس چیز کو بھی سچ بتاتی ہے جو تمھارے پاس ہے قبل اس کے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں پھر ان کو پیچھے پھیر دیں، یا ان پر ہم ویسی ہی پھٹکار برسائیں جیسی ہم نے سنیچر کے دن والوں پر پھٹکار کی، اور اللہ کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے''۔

لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ایک طبقہ ان تمام آیات کو بالکل نظر انداز کر کے اہل کتاب کی تعریف میں رطب اللسان رہا۔ انھیں مومن ثابت کرتا رہا اور ان کی ہر جائز و ناجائز بات کے لیے شریعت سے سند تلاش کرتا رہا۔

اس طرح کی کوششیں عالم عرب میں تو بہت پہلے سے ہو رہی تھیں؛ لیکن کچھ عرصے سے برصغیر ہندو پاک میں بھی اس کی گونج سنائی دینے لگی ہے، اور یہاں بھی بعض لوگ اس نظریے کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں، جن میں ڈاکٹر راشد شاز سرفہرست ہیں، ان کی، ۲۰۰۵ء اور مابعد کی اکثر تحریروں میں اس فکر کی ترجمانی کی گئی ہے۔

یہود و نصاری کو اہل ایمان ثابت کرنے کا مقصد

تقارب ادیان کے علم برداروں نے اہل کتاب کو امت مسلمہ کا ایک حصہ باور کرانے میں جو انتھک محنت صرف کی ہے، اس کے دو بنیادی مقاصد ہیں، جو انھی کی تحریروں کے متن اور بین السطور سے معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) اسلام کی دعوت دینے سے روکنا

ڈاکٹر راشد شاز لکھتے ہیں:

''خدا کے سچے متبعین خواہ وہ ابراہیمی سلسلے یعنی اسحٰق و یعقوب کی اولاد میں پائے جاتے ہوں یا ان سے باہر مجوس و صابئین میں ان کا شمار ہوتا ہو، یہ سب کے سب بسبب تقوی خدا کی رحمتوں کے مستحق ہیں۔ صدر اول کے مسلمان اس نقطے سے بھی نا آگاہ نہیں تھے کہ عبادات کی مختلف شکلیں اور سپردگی کے مختلف طریقے جو مختلف اقوام میں رائج چلے آتے ہیں انھیں بھی خدا کی نگاہ عبد شناس میں بڑا مرتبہ حاصل ہے۔ ﴿وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ﴾ جیسی آیات اس خیال کی توثیق کرتی تھیں کہ سناگاگ ہوں یا چرچ، خانقاہیں ہوں یا مساجد ان سب میں خدا کا ذکر کثیر ہوتا ہے،(۲) اور جب صورتحال یہ ہو تو مسلمان ساری دنیا کو ایک دین یا ایک طریقۂ عبودیت میں بدل ڈالنے کا خواب کیسے دیکھ سکتا ہے کہ اسے تو اول روز سے اس بات کے لیے تیار کیا گیا ہے کہ وہ تمام ایمانی طائفوں کی ایک ہمہ گیر اخوت (fellowship of faith) تشکیل دیں''۔(۳)

خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجیے تو یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ اس عبارت میں مسلمانوں کو اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہود و نصاریٰ، مجوس وصابئین ایمانی طائفے ہیں، اس لیے ان کو مسلمان بنانا اور ایمان کی دعوت دینا بے معنی ہے۔ اس کے بجائے ان کے ساتھ اخوت ایمانی (Fellowship of Faith) تشکیل دینے کی ضرورت ہے۔

(۲) اہل کتاب کو ان کے مذہب پر مطمئن کرنا

ڈاکٹر راشد شاز لکھتے ہیں:

''جس طرح مختلف شعوب وقبائل سے انسانوں کی نسبت محض تعارف کے لیے ہے ﴿وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْباً وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا﴾ [الحجرات:۱۳] اسی طرح یہ بھی خدائی اسکیم کا حصہ ہے کہ اس کے سچے بندے مختلف دینی شناخت کے ساتھ جانے جائیں۔ ﴿وَلَوْشَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ [الشوریٰ:۸] اگر خدا ترسوں کے مختلف گروہ انبیائے سابقین کی باقیات وذریات خود کو راہ یابی کے مختلف سلسلوں سے وابستہ پاتے ہوں، تو انھیں جان لینا چاہیے کہ تورات وانجیل بھی اسی خدا کی کتاب ہے اور وہاں بھی ہدایت اور روشنی موجود ہے''۔(۴)

اس عبارت میں اہل کتاب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تم بھی مسلم اور مومن ہو اور تمھارے طریقۂ عبودیت کو بھی خدا کی نگاہ عبد شناس میں بڑا مرتبہ حاصل ہے، اس لیے خواہ مخواہ اپنا طریقہ چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مذکورہ عبارتوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ نظریہ اسلام کو جتنا نقصان پہنچانے والا ہے شاید ہی کوئی نظریہ ہو؛ اس لیے کہ یہ درحقیقت ہدایت اور گمراہی، اسلام اور کفر کو ایک کرنا ہے۔ اگر اس کو مان لیا جائے تو اسلام پر قائم رہنے اور اس کی دعوت دینے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی اور پوری شریعت اسلامیہ پر خط نسخ پھر جاتا ہے؛ اس لیے اس خطرے کی سنگینی کو بروقت سمجھنا اور اُس کا تدارک کرنا بہت ضروری ہے۔

اگلی فصول میں ہم نے دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہود و نصاری کا کفر ایک وجہ سے نہیں؛ بلکہ بے شمار اسباب کی بنا پر ہے، اور قرآن وحدیث کے بے شمار نصوص ان کے کفر پر شاہد ہیں اور یہی ہمیشہ سے امت کا متفقہ نظریہ رہا ہے۔

حواشی

(۱) یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کو مسلم کہنے کے بجائے اہل کتاب کیوں کہا گیا؟ اس کا جواب ہم نے تفصیل سے ساتویں فصل میں دیا ہے۔

(۲) اس استدلال کی غلطی ہم نے آٹھویں فصل کے سولھویں استدلال میں واضح کردی ہے۔

(۳) ادراک زوال امت:۲/۵۰۰۔

(۴) ادراک.....:۲/۴۷۰۔ اس مغالطے کے ازالے کے لیے دیکھیے: نویں فصل، پندرھواں مغالطہ۔

(.....جاری)

☆☆☆

❑ تجزیہ

دعوتِ دین میں درپیش چیلنجز اور علما کی ذمہ داریاں

ڈاکٹر محمد اکرم ورکؔ، پاکستان

اصلاحِ احوال کے ذمہ دار طبقات میں جن دو طبقات کا کردار بنیادی نوعیت کا ہے، ان میں علمائے کرام اور حکمران طبقہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مجموعی انسانی رویوں کی تشکیل میں ان دو طبقات کا کردار سب سے اہم ہے۔ اگر کسی معاشرے کا دانشور طبقہ (Intellectuals) بد دیانت ہو جائے تو پھر اس معاشرے کی اصلاح کی امیدیں دم توڑنے لگتی ہیں۔ اس پس منظر میں دانشور طبقے کی اہمیت اور ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ سماجی اور معاشرتی سطح پر اصلاحِ احوال کے لئے اپنے دور کی تفہیم اور درپیش تحدّیات کا ادراک اہلِ علم کے لئے ضروری ہے۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر ان تحدّیات کا جائزہ پیش کرنا ہے جو داعیانِ اسلام کو دعوتِ دین میں درپیش ہیں۔ اس سلسلے میں ہماری معروضات حسبِ ذیل ہیں:

دعوتِ دین میں درپیش خارجی چیلنجز

۱۔ اسلام کی عالمگیریت:

اسلام نے اپنی دعوت کا آغاز ایک عالم گیر دین کی حیثیت سے کیا ہے، اس دین کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں خود اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف ''رب العالمین'' اور اپنے رسول کا ''رحمۃ للعالمین'' جیسے اوصاف سے کروایا ہے، اور پھر اپنی آخری کتاب قرآن مجید کو ''ھدی للناس'' کہہ کر اس کی عالمگیریت اور آفاقیت کو نمایاں کیا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ سب کا رب ہے، قرآن مجید پوری انسانیت کے لئے صحیفہ ہدایت ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت بھی عالمگیر (Global) ہے۔ پیغمبر نے صلح حدیبیہ (۶ھ) کے بعد شاہانِ عالم کے نام دعوتی خطوط روانہ فرما کر اس حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ اسلام کا پیغام پوری انسانیت کے لئے ہے، لیکن بدقسمتی سے مسلمان دورِ حاضر میں اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے رسالتِ محمدی ﷺ کی آفاقیت اور ہمہ گیریت کو اس طرح نمایاں نہیں کر سکے جس طرح کہ آپ پر ایمان لانے کا حق تھا۔ شاید یہ کہنا کسی حد تک درست ہو کہ اس وقت دیگر اقوام بالخصوص مغرب میں اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے حوالے سے جو غلط فہمیاں پائی جا رہی ہیں، اس کا ایک سبب خود مسلمان اور ان کا کردار بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو محسنِ انسانیت اور رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث کیا، آپ کی بعثت کے نتیجے میں سسکتی ہوئی انسانیت کو وہ زریں اصول عطا ہوئے، جن کو اپنا کر عرب قعرِ مذلت سے نکل کر اوجِ ثریا پر جا پہنچے۔ اس وقت عالمِ انسانیت جس روحانی کرب اور معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں میں مبتلا ہے اس کا واحد حل صرف اسلام کے پاس ہے۔ سیاسی اور معاشرتی سطح پر

جاگیر داری نظام(Feudalism) اور سوشلزم(socialism) کے ناکام تجربات کے بعد کیپٹلزم (Capitalism) نے انسانیت کو تباہی کے جس دہانے پر لا کھڑا کیا ہے، اس کے بعد اسلام ہی بنی نوع انسان کے لئے واحد آپشن کے طور پر باقی بچتا ہے، اب تو خود مغرب کا دانشور طبقہ بھی اس حقیقت کا اعتراف کر رہا ہے۔ برطانوی ولی عہد شہزادہ چارلس نے اپنے ایک مضمون "Islam and the west" میں مغربی دانشوروں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ ایک متبادل نظام کے طور پر اسلام کا مطالعہ کریں؛ لیکن ستم ظریفی ملاحظہ کیجیے کہ اسلام کو عالمگیر دین سمجھنے والے مسلمان دانشور عصری احوال وظروف میں دینِ اسلام کو متبادل بیانیے کے طور پر پیش کرنے کی صلاحیت سے ہی عاری ہیں۔ مسلمان اہلِ علم کی علمی تگ وتاز کے میدان دیکھتے ہوئے تو یہی واضح ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے عالمگیر اور پوری انسانیت کا دین ہونے کے تصور سے عملاً دستبردار ہو چکے ہیں، یہ اپروچ کسی المیے سے کم نہیں ہے۔ دورِ حاضر میں داعیانِ اسلام کے لئے ایک بڑا چیلنج تو یہی ہے کہ وہ اسلام کی آفاقیت کے تصور کو دوبارہ سے دریافت کریں۔

۲۔ سیکولرازم:

کہنے کی حد تک تو سیکولرازم (Secularism) سے مراد لادینیت ہے؛ لیکن عملاً مغربی فکر وفلسفے کی بنیاد پر پروان چڑھنے والا سیکولرازم بذاتِ خود ایک دین اور عقیدے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ مغربی تہذیب نے گذشتہ کئی صدیوں میں فکری ارتقا کا کٹھن سفر طے کیا ہے، مسلسل فکری ارتقا اور تہذیبی تجربات کے نتیجے میں ان کے ہاں کئی تصوّرات اور نظریات اب مسلمہ عقائد کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اہلِ مغرب اب ان نظریات پر کوئی سمجھوتا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مغرب نے سماجی، معاشرتی اور اخلاقی حوالے سے جو تجربات کئے ہیں اس کے نتیجے میں ان کے ہاں یہ سوچ پختہ ہو چکی ہے کہ انسانیت اپنے سماجی ارتقا کی آخری سیڑھی پر قدم رکھ چکی ہے۔ مغرب میں "The End of History" کے عنوان سے لکھی جانے والی کتب اسی سوچ کی مظہر ہیں کہ مغربی فکر وفلسفہ کے نفاذ میں ہی انسانیت کی بقا ہے۔ مغرب کو اسلام کی ان تعلیمات سے کوئی سروکار نہیں ہے جن کا تعلق انسان کی نجی اور انفرادی زندگی سے ہے؛ لیکن وہ مسلمانوں کو یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں کہ وہ نظامِ خلافت کی بات کریں اور اجتماعی زندگی میں مذہب کے کردار کی دعوت دیں۔

مغربی فکر وفلسفہ کی بنیاد عقل پر ہے، دیکھا جائے تو ایک لحاظ سے مغرب کا خدا عقل ہے، اور صرف وہی چیز ان کے ہاں قابلِ قبول ہے جو عقلی اصولوں پر ثابت ہو۔ مسلمان اہلِ علم کو اس حقیقت کا ادراک کرنے کی ضرورت ہے کہ اس وقت مغربی سیکولرازم انسانوں کا مقبولِ عام مذہب بن چکا ہے، جبکہ اس کے بالمقابل مذاہبِ عالم اپنی غیر عقلی اور غیر فطری تعلیمات کی وجہ سے محض تاریخ بنتے جا رہے ہیں۔ اس پس منظر میں علمائے کرام پر لازم ہے کہ سیکولرازم کے بنیادی سوالات کا سامنا کریں۔ سیکولرازم کے بنیادی سوالات (۱) انسانی حقوق (۲) دین اور سیاست کا باہمی تعلق (۳) مرتد کی سزا (۴) آزادیِ نسواں (۵) آزادیِ اظہارِ رائے (۶) جمہوریت (۷) جہاد (۸) مذہبی رواداری اور اسی نوعیت کے دیگر موضوعات سے متعلق ہیں۔ مغرب کے فکری چیلنج سے نبرد آزما ہونے کے لئے علمائے کرام کے لئے ضروری کہ وہ دینی احکام کے اسرار وحکم کو نئے سرے سے دریافت کریں۔ دورِ حاضر میں دینی احکام کی عقلی تعبیر دعوتِ دین میں ''اصولِ حکمت'' کا بنیادی تقاضا ہے۔ اس حوالے سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی شہرہ آفاق کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' اور اس جیسی دیگر کتب سے استفادہ کی ضرورت ہے۔

داعیانِ اسلام کے لئے ان اسباب اور وجوہات کا ادراک بھی لازم ہے جن کی وجہ سے مغرب میں دین سے نفرت پیدا ہوئی، مذہب کے حوالے سے اہلِ مغرب کی نفسیات کو سمجھنے

کے لئے یورپ کے دورِ تاریک (Dark Ages) میں کلیسا اور علم جدید میں تصادم کی تاریخ پر گہری نظر ضروری ہے، اس دور کی درست تفہیم سے ہی ہمیں مغرب میں عیسائیت سے لوگوں کی نفرت کی وجوہات کا اندازہ ہو سکے گا اور ہم جان پائیں گے کہ کس طرح عیسائیت کی غیر عقلی اور غیر فطری تعلیمات، پوپ کے خدائی اختیارات، مذہب اور سائنس کا تصادم، پوپ کی حکمران طبقے کی ناجائز حمایت وغیرہ نے عام لوگوں کو عیسائی مذہب سے متنفر کیا۔ لازم ہے کہ علمائے کرام دلائل سے واضح کریں کہ عیسائیت اور اسلام میں کیا فرق ہے؟ اور بتائیں کہ جن وجوہات کی بنا پر مغرب میں لوگ مسیحیت سے متنفر ہوئے ان کے بارے اسلام کا موقف کیا ہے؟ نیز مسیحیت میں پوپ اور علمائے اسلام کی دینی حیثیت میں فرق واضح کرنا بھی ضروری ہے۔ داعیانِ اسلام پر لازم ہے کہ مذاہب کے تقابلی مطالعے کے ساتھ مغربی فکر و فلسفہ کا تجزیاتی مطالعہ بھی کریں اور مغربی فکر کی اصولی غلطیوں کو واضح کریں۔

۳۔ بین المذاہب ہم آہنگی:

مذہبی تکثیریت پر مبنی معاشروں میں مسلمانوں کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے؟ اس حوالے سے اسلام اپنی شاندار تاریخ رکھتا ہے۔ اسلام اس دعوے کے ساتھ کھڑا ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرتِ سلیمہ پر پیدا کیا ہے اور ہدایت اور رہنمائی کے لئے اسے عقل جیسی نعمت سے سرفراز کیا ہے اور پھر مزید مہربانی یہ فرمائی کہ اسے حق کی یاددہانی کے لئے تسلسل کے ساتھ انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے خیر و شر اور حق و باطل کے انتخاب میں انسان کو اختیار دیا اور یہی بنی نوعِ انسان کی آزمائش ہے۔ اس امکان کو تسلیم کر لینے کے بعد کہ مختلف اسباب کی بنا پر تمام لوگ خدا پر ایمان لانے والے نہیں ہوں گے، اسلام لوگوں کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ وہ تناظر ہے جس میں اسلام مذہبی رواداری اور آزادی اظہارِ رائے کا داعی ہے۔ اسلام بین المذاہب ہم آہنگی (Inter-Faith Dialogue) اور اقوام کے ساتھ تعمیری تعلقات کے حوالے سے واضح رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ قرآن مجید نے دیگر قوموں کے ساتھ مکالمے کے جو بنیادی اصول بیان کئے ہیں وہ یہ ہیں: (اُدعُ اِلٰی سَبِیلِ رَبِّكَ بِالحِكمَةِ وَالمَوعِظَةِ الحَسَنَةِ وَجَادِلهُم بِالَّتِی هِیَ اَحسَنُ) (1) (آپ لوگوں کو اپنے پروردگار کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت سے بلائیے اور ان کے ساتھ پسندیدہ طریقہ سے بحث کیجئے۔) میثاقِ مدینہ، معاہدہ نجران اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں غیر مسلموں سے کئے گئے سیاسی معاہدات ہمارے دعویٰ کی سب سے بڑی دلیل ہیں۔ شاہانِ عالم کے نام رسول اللہ ﷺ کے دعوتی خطوط اس حوالے سے ہمارے لئے رہنمائی کا بڑا ذریعہ ہیں۔ اسلام کے اصولِ دعوت میں موعظہ حسنہ اور مجادلہ کے ساتھ مکالمہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ویسے بھی سماجی مقاطعہ (Social Boycott) کی نفسیات ان گروہوں میں پائی جاتی ہے جن کو اپنی دلیل کی طاقت پر اعتماد نہیں ہوتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ قریشِ مکہ نے رسول اللہ ﷺ کا مقاطعہ کیا تھا، اس لئے کہ ان کے پاس رسول اللہ ﷺ کے دلائل کا کوئی جواب نہیں تھا، آپ تو ان سے گفتگو کے مواقع تلاشنے میں لگے رہتے تھے۔

دیگر قوموں کے برعکس بین المذاہب ہم آہنگی کے حوالے سے مسلمانوں کا رویہ ہمیشہ قابلِ ستائش رہا ہے، تاریخ گواہ ہے کہ مختلف ادوار میں یہود و نصاریٰ میں سے جس گروہ کو بھی سیاسی غلبہ حاصل ہوا اس نے دوسرے فریق پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیے، لیکن مسلمانوں کے سیاسی اور تہذیبی غلبے کے دور میں دونوں گروہوں نے اسلام کے زیرِ سایہ ہی امن و سلامتی کے ساتھ رہنا سیکھا۔ برّصغیر کے مسلمان تو اس حوالے سے اور بھی منفرد تاریخ رکھتے ہیں، یہ حقیقت کچھ کم تعجب انگیز نہیں ہے کہ تقریباً بیس (۲۰) فیصد لوگ محض اپنی رواداری اور برداشت کے رویے کی وجہ سے اسی (۸۰) فیصد لوگوں پر صدیوں تک حکومت کرتے رہے۔ رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے مسلمانوں کو یہ

ہدایت کی گئی ہے: قُل یَا اَھلَ الکِتَابِ تَعَالَوا الَی کَلَمَۃٍ سَوَاء بَینَنَا وَبَینَکُم اَلَّا نَعبُدَ الَّا اللّٰہ وَلَا نُشرِکَ بِہِ شَیئاً (2) (آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب! ایسے قول کی طرف آجاو جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں)۔ دورِ حاضر میں مسلمانوں کی بدقسمتی ملاحظہ فرمائیں کہ وہ بین المذاہب ہم آہنگی تو بڑی دور کی بات ہے، بین المسالک ہم آہنگی کی صلاحیت سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔ مذاہبِ عالم سے ہم آہنگی کے حوالے سے داعیان اسلام کے لئے حضورﷺ کی مکی اور مدنی زندگی کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے ازبس ضروری ہے کہ دیکھا جائے کہ آپ کا غیر مسلموں کے ساتھ رویہ کیا تھا؟ اور مدنی ریاست میں تمام گروہوں کو جو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی اس کی حدود اور اصول وضوابط کیا تھے؟

داعیانِ اسلام پر لازم ہے کہ وہ منکر اور گستاخ میں فرق کو ملحوظ رکھیں، اہم سوال یہ ہے کہ کیا غیر مسلم ہماری دعوت کا مخاطَب ہے یا نہیں؟ اگر تمام غیر مسلم ہماری دعوت کے مخاطَبین ہیں تو پھر سماجی مقاطعہ چہ معنیٰ دارد؟ رسول اللہﷺ کا اسوہ حسنہ تو یہ ہے کہ آپ غیر مسلموں کو کھانے کی دعوت پر بلاتے تھے اور ان کی دعوت قبول بھی کر لیتے تھے۔ آپ ایک یہودی کے جنازے کے احترام میں کھڑے ہو گئے اور ایک یہودی کا بچہ آپ کے خدمت گاروں میں بھی شامل تھا۔ آپ نے مسجدِ نبوی میں نجران کے عیسائی وفد کو اجازت دی کہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کر سکتے ہیں۔ ان چند مثالوں کو ذکر کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ داعیانِ اسلام اپنے اسلوبِ دعوت پر غور کریں، اور اس حقیقت کا ادراک کریں کہ چند ہزار صحابہ کرامؓ نے تو ایک صدی بھی مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ اسلام کے پیغام کو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچا دیا، اور آج کروڑں مسلمان اور بلا مبالغہ لاکھوں داعیانِ اسلام اس مشن میں ناکام کیوں ہیں؟

۴۔ روزمرہ کی زبان:

دعوتِ دین میں ہم زبانی کی اہمیت شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ رسول اللہﷺ کے نزدیک دعوتِ دین اور مکالمہ بین المذاہب کے لئے مخاطَب کی زبان سے واقفیت کی اہمیت کیا ہے، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے مختلف صحابہ کرامؓ کو دوسری قوموں کی زبانیں سیکھنے کا حکم دیا، کیونکہ دعوت وتبلیغ اور باہمی مکالمہ میں تاثیر اور قوت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب داعی اور مدعو کی زبان ایک ہو۔ ہم زبانی سے اُنسیت میں اضافہ ہوتا ہے، اجنبیت دور ہو جاتی ہے اور گفتگو کا مقصد آسانی سے سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر رسول اللہﷺ نے حضرت زید بن ثابتؓ (م ۴۴ھ) کو سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا، تاکہ یہود سے انہی کی زبان میں گفتگو کی جا سکے اور ان کے خطوط کا جواب دیا جا سکے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کا بیان ہے: ''فتعلّمت کتابھم مامرّت بی خمس عشرۃ لیلۃ حتی حذقتہ وکنت أقرأ لہ کتبھم اذا کتبوا الیہ واجیب عنہ اذا کتب''(3) ''پس میں نے ان کی زبان میں لکھنا سیکھ لیا، ابھی پندرہ دن نہیں گزرے تھے کہ میں اس میں ماہر ہو گیا۔ جب یہودی کوئی خط آپ کی طرف لکھتے تو میں آپ کو پڑھ کر سنا دیتا اور اگر آپ کو جواب لکھنا ہوتا تو میں وہ لکھ دیتا۔'' ایک روایت میں ہے کہ ایک ایرانی عورت حضرت ابو ہریرہؓ (م ۸۵ھ) کی خدمت میں استغاثہ لے کر آئی کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اب مجھ سے میرا بیٹا بھی چھیننا چاہتا ہے۔ اس عورت نے یہ ساری گفتگو فارسی زبان میں کی اور ابو ہریرہؓ نے بھی اس سے اسی زبان میں گفتگو کی اور پھر آپؓ نے بچہ عورت کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔(4) ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ نے دوسری قوموں کی زبانیں صرف اس غرض سے سیکھ رکھی تھیں، تاکہ ان سے براہ راست تبادلۂ خیال کر کے ان کے مسائل کو حل کیا جا سکے۔ بعض روایات

سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے قرآن مجید کے بعض اجزا کا دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی کیا تھا، تاکہ عربی زبان سے ناواقف لوگ اسلام کی حقیقی روح اور تعلیمات سے محروم نہ رہ جائیں۔ چنانچہ علامہ سرخسیؒ (م۴۹۰ھ) لکھتے ہیں:

''ان الفرس کتبوا الی سلمانؓ ان یکتب لھم الفاتحة بالفارسیة فکانوا یقرئون ذالك فی الصلوة حتیٰ لانت السنتھم للعربیة ''(5)''بعض نو مسلم ایرانیوں نے حضرت سلمانؓ کی خدمت میں لکھا کہ ان کے لیے سورہ فاتحہ کو فارسی میں نقل کر دیا جائے، چنانچہ وہ لوگ (اسی ترجمہ کو) نماز میں پڑھتے تھے یہاں تک کہ وہ عربی سیکھ گئے۔''اسی واقعے کو ڈاکٹر حمیداللہؒ نے ''النہایۃ حاشیۃ الھدایۃ'' کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ (م۳۳ھ) نے رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے یہ کام انجام دیا اور ان کے ترجمے کا ایک جز بھی نقل کیا ہے، ''بنام خداوند بخشایندہ مہربان'' یہ بسم اللہ کا ترجمہ ہے۔(6) شاہانِ عالم کی طرف بھیجے جانے والے نبوی سفراء کا معجزانہ طور پر انھی قوموں کی زبان میں گفتگو کرنے لگ جانا بھی دعوت وتبلیغ اور مکالمے میں ہم زبانی کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔(7) اس کے علاوہ جن صحابہ کرامؓ کو رسول اللہ ﷺ نے مختلف قوموں کی طرف داعی اور مبلغ بنا کر روانہ فرمایا، اس میں بھی یہ چیز آپ کی حکمتِ عملی کا حصہ نظر آتی ہے کہ وہ مبلغ اسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں، اور اگر مبلغین کا تعلق کسی دوسری قوم سے ہو تو کم ازکم وہ اس قوم کی زبان، رسم ورواج اور کلچر سے لازمی طور پر آگاہ ہوں۔

مذکورہ بالا چند حوالہ جات سے واضح ہوتا ہے کہ دعوت وتبلیغ کے لیے مدعو قوموں کی زبان، کلچر اور نفسیات سے آگاہی کس قدر اہم ہے، اس حوالے سے ویسے تو پورے عالم اسلام کی حالت ہی ناگفتہ بہ ہے، تاہم اگر اسلامیانِ ہند سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام کے طرزِ عمل کا تجزیہ کیا جائے تو صورتِ حال کی سنگینی کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ اس حد تک تو یہ بات قابلِ فہم ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست کے بعد بچی کچی مسلمان قیادت نے دینی مدارس میں جو نصاب رائج کیا، اس کا بنیادی مقصد لوگوں کے ایمان کی حفاظت تھا، تاکہ ہندوستان کو اندلس بننے سے بچایا سکے۔ یہ اعتراف بھی لازم ہے کہ ہندوستان کے علمائے کرام کی قربانیوں اور دینی مدارس کے شاندار کردار کی وجہ سے یہ مقصد پورا ہو گیا، لیکن آزادی کے بعد نصابِ تعلیم میں جس تبدیلی کی ضرورت تھی اس کی طرف توجہ نہ دی جاسکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ایسے علمائے کرام کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی ہے جو آج کی زبان اور محاورے میں گفتگو کر سکیں۔ آج کے داعیانِ اسلام پر اصحاب کہف کی مثال صادق آتی ہے، کہ تقریباً تین صدیوں کی نیند سے بیدار ہونے کے بعد جب وہ غار سے نکلے تو ان کا سکہ اور زبان دونوں ان کی اپنی بستی کے لوگوں کے لئے اجنبی ہو چکے تھے، گویا وہ اس زمانے کے لئے غیر متعلق (Irrelevant) ہو چکے تھے، اور بالآخر ان کو واپس غار میں ہی پناہ لینی پڑی۔ غلامی کے طویل دور سے نکلنے کے بعد ہماری صورتِ حال بھی اصحابِ کہف ہی کے مماثل ہے، عصری تقاضوں کے مطابق علمائے کرام کی تربیت کے بغیر اسلام کی عالمی سطح پر دعوت کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ دورِ حاضر میں داعیانِ اسلام اگر بین الاقوامی قوانین، جدید نظامہائے معیشت وسیاسیات اور مغرب کے فلسفہ اخلاق سے واقف نہیں ہوں گے تو ان کے مخاطبین کا دائرہ صرف مسلم معاشروں تک ہی محدود رہ جائے گا اور اگر وہ ''کتاب البیوع'' اور ''کتاب الامارۃ'' کی عصری تعبیرات پر عالمانہ دسترس نہیں رکھتے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ دین کا ایک بڑا حصہ ان کے دعوتی مضامین ہی سے خارج ہو جائے گا، اور اسلام کے مکمل ضابطۂ حیات ہونے کے تصور کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنے کا قوی اندیشہ ہے۔

دعوتِ دین میں درپیش داخلی چیلنجز

۱۔عرف کی تفہیم:

انسانی معاشرہ ہر لمحہ تغیر پذیر ہے، معاشرتی اور

تہذیبی ارتقا کا لازمی نتیجہ عرف کی تبدیلی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ بہت سارے فقہی احکام ومسائل کا تعلق عرف کے ساتھ ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ عرف کی تبدیلی کے براہِ راست اثرات فقہی احکام و مسائل کے استنباط پر مرتب ہوتے ہیں۔عرف اور زمان ومکان کی تبدیلی فقہی مسائل کے استنباط پر کس حد تک اثر انداز ہوتی ہے، اس کا اندازہ صرف اس ایک مثال سے ہی کیا جا سکتا ہے کہ امام مالکؒ (م ۱۹۷ھ) کے نزدیک پانی کے طاہر ہونے کے لئے اس کی کم ازکم مقدار ''قُلَّتَان''یعنی دو بڑے مٹکوں کے برابر ہونا لازم ہے، جبکہ امام ابوحنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) کے نزدیک پانی کے طاہر ہونے کے لئے اس کی کم ازکم مقدار ''دہ در دہ'' ہونا ضروری ہے۔ ایک امام مدینہ میں بیٹھ کر یہ رائے قائم کر رہا ہے جہاں پانی کی شدید قلت ہے، جبکہ دوسرا امام دجلہ وفرات کے کنارے بیٹھ کر فتویٰ جاری کر رہا ہے جہاں پانی وافر مقدار میں موجود ہے، گویا عرف اور زمان ومکان کی تبدیلی کے اثرات مسائل کے استنباط پر براہِ راست مرتب ہوتے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ جب غیر مشروط اطاعت صرف خدا ورسول کے لئے ہی ہے تو پھر فقہ کی تقدیس چہ معنیٰ دارد؟ جبکہ فقہ سے مراد دین نہیں بلکہ دینی تعبیرات ہیں یعنی وہ تمام فروعی مسائل جو واضح طور پر قرآن وسنّت میں موجود نہ ہوں اور ان کو مقاصد شریعت کی روشنی میں قرآن وسنّت سے مستنبط کیا گیا ہو۔اس نوعیت کے مسائل میں ایک تو وہ احکام ہیں جن کے بارے میں اسلاف نے کوئی رائے قائم کی ہو اور دوسرے وہ احکام ہیں جن کا تعلق زمان و مکان اور عرف کی تبدیلی سے ہے۔اس میں متوازن رائے یہ کہ اگر کسی مسئلے میں صحابہ کرامؓ کی رائے منقول ہو تو فبہا، اور اگر دیگر اہل علم کی مختلف آراء منقول ہوں تو یہ ہر دور کے علما کا حق ہے کہ وہ کسی بھی رائے کو دلیل کے ساتھ قبول کریں اور دلیل کے ساتھ رد کردیں۔ صحابہ کرام کے علاوہ دیگر اربابِ فکرو دانش کے حوالے سے بہترین بات وہی ہے جو امام ابو حنیفہؒ نے فرمائی: ''ھُم رِجَال وَ نَحنُ رِجَال ''یعنی جس طرح انہیں اجتہاد کا حق حاصل ہے اسی طرح ہمیں بھی یہ حق حاصل ہے۔ وہ تمام فقہی مسائل جن میں صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلاف منقول ہے، اس کو تنوع اور توسع پر محمول کر کے کسی ایک پہلو کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔

علمائے کرام جب مختلف احکام ومسائل پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں تو عمومی طور پر وہ ان مسائل کو فقہی تناظر میں ہی دیکھتے ہیں اور ان کے سماجی تناظر کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اس کی مثال عائلی زندگی سے متعلق نکاح، طلاق اور خلع جیسے مسائل میں دیکھی جاسکتی ہے۔ کیا آج کے معاشرتی ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے ولی کے بغیر نکاح کو درست قرار دیا جانا چاہیے؟ جبکہ نکاح کے انعقاد کے لئے اگر ایک طرف عاقل وبالغ کی رائے ضروری ہے، تو دوسری ''لا نکاح الا بولی ''، کی شرط بھی موجود ہے۔اسی طرح طلاقِ ثلاثہ سے متعلق مسائل کو محض فقہی تناظر میں ہی دیکھا جاتا ہے۔ اس کے عملی نتائج خاندانوں کو کس طرح برباد کر رہے ہیں یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی جاتی۔ غور کیا جائے تو بہت سارے مسائل میں صحابہ کرام اور فقہاء کے درمیان جو اختلافات نظر آتے ہیں اس کا بڑا سبب وہ سماجی تناظر ہے جس میں انہوں نے مختلف اور متنوع نصوص پر غور کیا اور پھر اس نص کو ترجیح دے دی یا اس تعبیر کو اختیار کر لیا جس میں حالات اور زمان و مکان کی رعایت نظر آئی یا پھر خلقِ خدا کے لئے آسانی اور سہولت کا پہلو نظر آیا۔ ہمارے ہاں عملی صورتِ حال یہ ہے کہ علمائے اسلام اپنے مسلک اور فقہی مذاہب سے ہٹ کر آج کے ماحول اور عرف کی روشنی میں قرآن وسنّت کا مطالعہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

اس وقت مذہب کو علمِ جدید کا سنجیدہ چیلنج درپیش ہے۔ جدید سائنسی علوم نے انسانی زندگی پر جو اثرات مرتب کئے ہیں اس کے نتیجے میں کئی نئے سوالات کھڑے ہو گئے ہیں۔

مثلاً DNA ٹیسٹ کے سو فیصد درست نتائج نے گواہی اور حسب ونسب جیسے مسائل کے حوالے سے نئے سوالات کھڑے کر دیئے ہیں۔ غالباً 2002ء میں جب سائنسدانوں نے محض جینز کی مدد سے ''ڈولی'' نامی بھیڑ تخلیق کی تو علماء کے لئے اس پر کوئی واضح موقف اختیار کرنا مشکل تھا۔ ٹیسٹ ٹیوب بے بی (Test tube baby) اور کلوننگ (Cloning) جیسے کامیاب تجربات نے ماں کے قدموں تلے جنت کے تصور کو چیلنج کر دیا۔ اس نوعیت کی محیر العقول ایجادات اور تخلیقات نے انسان کے لئے جہاں کئی آسانیاں پیدا کی ہیں وہیں بہت سے سوالات بھی کھڑے کر دیے ہیں۔ اب بہت سارے مسائل کو صرف سابقہ فتاویٰ کی بنیاد پر بیان کرنا ممکن نہیں رہا، اس لئے علما کے لئے اپنے دور کی حقیقی تفہیم بڑا چیلنج بن کر ابھر رہی ہے۔

دورِ حاضر میں علمائے کرام کے لئے صرف علاقائی عرف کا جاننا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اسلام کی عالمگیریت کے تناظر میں عالمی عرف سے گہری واقفیت بھی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر فقہائے اسلام نے ''دالاسلام'' اور ''دارالحرب'' کی تقسیم کے ساتھ قرآن و سنّت سے جو احکام مستنبط کئے ہیں، ان تعبیرات کا تعلق مسلمانوں کے دورِ عروج سے ہے، جبکہ اس وقت صورتِ حال بالکل تبدیل ہو چکی ہے۔ جزیہ، ذمی اور اہل کتاب سے متعلق احکام ومسائل کو ان عالمی قوانین کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے جن کو خود مسلمان ملک تسلیم کر چکے ہیں۔ تسلیم کرنا ہوگا کہ ''انسانی حقوق کا عالمی منشور'' (Universal Declaration of Human Rights) آج کا عالمی قانون ہے۔ اس قانون کی تمام شقوں کو قبول کرنا تو مسلم معاشروں کے لیے ممکن نہیں ہے، تاہم اس بحث میں زیادہ مثبت اور تعمیری انداز میں حصہ لینے کی ضرورت ہے اور اگر کسی جگہ لچک کی گنجائش موجود ہو تو اس کا لحاظ کیا جانا چاہیے۔ سیرتِ طیبہ میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ کئی مواقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے بھی بین الاقوامی قانون، عرف اور قبائلی رسم ورواج کا احترام کیا۔ مثلاً: جب حضور ﷺ کا مسیلمہ کذّاب کے سفیروں سے مکالمہ ہوا تو آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تم مسیلمہ کو نبی مانتے ہو؟ تو انھوں نے کہا: ہاں، حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت ہے کہ مسیلمہ کذّاب کے سفیروں کے جواب میں آپ نے فرمایا: ''لو کنت قاتلاً رسولاً لقتلتکما، فمضت السنّة انّ الرّسلَ لا تَقتُل ''(8) یعنی اگر سفیروں کا قتل جائز ہوتا تو میں تمہیں قتل کروا دیتا۔ دیکھئے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے؛ لیکن آپ نے ان پر یہ حد جاری نہیں کی؛ بلکہ فرمایا کہ چونکہ عالمی قانون یہ ہے کہ سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا اس لئے میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں، ورنہ میں تمہیں قتل کروا دیتا۔

سن ۹ ہجری میں اقرع بن حابسؓ کی زیرِ قیادت بنو تمیم کا وفد اسلام قبول کرنے کے لیے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا، ان لوگوں نے قبولِ اسلام کے لیے بڑی عجیب شرط رکھی کہ آپ پہلے ہمارے ساتھ مفاخرت کریں، آپ کا خطیب ہمارے خطیب کا اور آپ کا شاعر ہمارے شاعر کا مقابلہ کرے، تب ہم اسلام قبول کریں گے۔ آپ نے ان کے اس مطالبہ کو قبول کیا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے حکم پر حضرت حسان بن ثابتؓ نے ان کے شاعر زبرقان بن بدر کا مقابلہ کیا اور ثابت بن قیسؓ نے ان کے خطیب عطارد ابن حاجب کا مقابلہ کیا۔ بنو تمیم نے بالآخر حضور ﷺ کے شاعر اور خطیب کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔ (9) دیکھا جائے تو وفدِ بنی تمیم کا مطالبہ بالکل لایعنی تھا، بالفرض اگر مسلمانوں کا شاعر اور خطیب مقابلے میں شکست بھی کھا جاتے تو پھر بھی اسلام کی حقانیت میں کوئی شک نہ تھا، لیکن اس کے باوجود آپ نے ان کے رسم ورواج کا احترام کیا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دوسری قوموں کے ساتھ مکالمے کی اتنی زبردست تیاری کر رکھی تھی کہ بنو تمیم نے جب قبولِ اسلام کی یہ عجیب وغریب شرط رکھی تو

آپ نے بلا جھجک اپنے ان ساتھیوں کو طلب کیا جن کی خاص اسی مقصد کے لئے تربیت کی گئی تھی۔ اسی طرح جب آپ نے شاہانِ عالم کے نام دعوتی خطوط روانہ کرنے کا پروگرام بنایا تو واقفانِ حال نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! حکمرانوں میں یہ اصول ہے کہ وہ ان خطوط پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتے جن پر کوئی مہر (Seal) وغیرہ نہ ہو، چنانچہ اسی وقت آپ نے خطوط کو مُہر بند کرنے کے لیے مُہر بنانے کا حکم دیا۔(10)

اس ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ داعیانِ اسلام کے لئے لازم ہے کہ وہ عالمی عرف کو سمجھیں اور ان قوانین اور معاہدات کے مندرجات کا بھی تنقیدی مطالعہ کریں جن کی حیثیت اب مسلمہ بین الاقوامی قانون کی ہے، اور جن کی پاسداری کا حلف خود مسلمان ممالک نے بھی اٹھا رکھا ہے۔ عالمی عرف اور بین الاقوامی معاہدات کے مثبت مطالعہ و تجزیہ سے مسلم معاشروں کے علاوہ عالمی سطح پر دعوتِ دین کی سرگرمیوں کو مزید موثر بنایا جاسکتا ہے۔

۲۔فرقہ واریت:

عصر حاضر کا ایک بڑا فتنہ مختلف عنوانات کے ساتھ اسلام کی تقسیم ہے۔ صوفی اسلام، تبلیغی اسلام، سلفی اسلام، وہابی اسلام، جہادی اسلام، سیاسی اسلام، یہ تقسیم شیعہ اور سنّی اسلام کے علاوہ ہے۔ اس کے علاوہ دین کی فقہی اور کلامی تعبیرات کو مکمل دین کے طور پر پیش کرنے کا رجحان بھی پوری شدّ ومد کے ساتھ موجود ہے۔ حالات اس نہج پر پہنچ چکے ہیں کہ مساجد اور مدارس کے ناموں سے مسالک کی نشاندہی کی جاسکتی ہے، اس پر مستزاد یہ کہ آپ مذہب سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے ناموں، کاموں اور حلیے سے بآسانی ان کا مسلک معلوم کرسکتے ہیں۔ علمائے کرام دین، مذہب، مسلک، ذوق اور تاریخ میں فرق کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جس سے فرقہ واریت میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ زمینی حقائق یہ ہیں کہ علمائے کرام کی اکثریت اپنے مسالک، فقہی مذاہب اور روحانی سلاسل کو ہی کل دین کے طور پیش کررہی ہے۔ اس سے بھی تلخ حقیقت یہ ہے کہ بعض کوتاہ نظر اور نام نہاد علماء نے بعض تاریخی واقعات اور علاقائی رسم ورواج کو ہی کل دین کا درجہ دے رکھا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ کلامی، فقہی اور اسلامی فرقوں کا مثبت انداز میں مطالعہ کیا جائے۔ بین المسالک ہم آہنگی کا فروغ اس دور کی ضرورت ہے۔ مسلک اور دین میں فرق کئے بغیر ہم آہنگی کا صرف خواب ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ نصوص، اجتہادات اور رواجات میں فرق کی ضرورت کو نظر انداز کردیا گیا ہے۔ فروعی مسائل اور بنیادی عقائد میں فرق نہیں کیا جارہا۔ سماجی رسوم وآداب میں بھی ہمارا رویہ بڑا عجیب وغریب ہے، کسی رواج کا اسلام کے مطابق ہونا اور چیز ہے اور اسلام ہونا بالکل دوسری چیز ہے، دین اور کلچر کا باہمی تعلق اور اس کی حدود کیا ہیں؟ یہ بات بھی سمجھنا بہت ضروری ہے، ورنہ اس ملت کو نئے سے نئے فتنوں سے بچانا ممکن نہیں ہوگا۔

آج کے ماحول میں ایک سچے داعی کے لئے صحیح رویہ یہی ہوسکتا ہے کہ وہ اسلام کو مکمل ضابطہ حیات کے طور پر تسلیم کرے، اب بے شک وہ عملی جدوجہد کے لئے کسی ایک میدان کا انتخاب کرلے، لیکن دین کے دوسرے شعبوں کے ساتھ اس کو مربوط کرے، اور مناسب یہ ہے کہ وہ دوسرے شعبوں میں کام کرنے والے لوگوں کی قدر کرے۔ فروعی مسائل میں دین میں تنوع اور توسع کے حوالے سے اعتدال پسند علماء کی فکر کا مطالعہ رہنمائی کے لئے مناسب ہوگا۔ اگر اس اصول کو مان لیا جائے کہ فرقہ بنیادی عقائد میں انحراف سے بنتا ہے تو اس لحاظ سے دیوبندی، بریلوی اور اہلحدیث ایک ہی گروہ شمار ہوں گے اور ان کے مقابل شیعہ دوسرا گروہ شمار ہوگا، ملی یکجہتی کا تقاضا یہ ہے کہ شیعہ کی عمومی تکفیر سے اجتناب کرنا چاہیے، تاہم شیعہ کے وہ ذیلی فرقے جن کی تکفیر خود اہلِ تشیع نے کی ہے ان کا معاملہ البتہ دوسرا ہے، کیونکہ شیعہ کے بعض اقلیتی گروہوں کی گمراہی کے دلائل موجود ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی (م ۱۹۰۸ء) کی جانب

منسوب ''جماعتِ احمدیہ'' کو ایک باطل فرقہ کہنا حق بجانب ہے کیونکہ وہ ختم نبوت کے بنیادی عقیدے کے منکر ہیں۔

۳۔مروّجہ تصوّف:

جس طرح تصوف کو عینِ دین کہنا غلط ہے اسی طرح تصوف کو متوازی دین کہنا بھی غلط ہے، بلکہ درست یہی ہے کہ یہ دین کی روحانی تعبیر کا ایک ایسا پہلو ہے جو ''وَيُزَكِّيهِمْ'' کے عنوان کے ساتھ منصبِ رسالت کا لازمی تقاضا ہے اور رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت ہے۔ ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے اپنے تکوینی نظام کے مطابق مختلف افراد اور گروہوں سے دین کی حفاظت اور ترویج و اشاعت کا کام لیا۔ محدثین اور ائمہ جرح و تعدیل نے متون (Texts) کی حفاظت کا کارنامہ اس انداز میں انجام دیا کہ تاریخ علوم میں اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے۔ فقہائے کرام نے اس متن کو بنیاد بنا کر دین اسلام کو معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا عظیم کارنامہ انجام دیا اور ثابت کیا کہ دین اسلام صرف آخرت ہی نہیں بلکہ دنیوی کامیابی کا بھی ضامن ہے، صوفیہ کرام نے تزکیہ نفس کے عنوان کے ساتھ دین کے روحانی پہلو کو اجاگر کیا، خدمتِ خلق اور ذاتی کردار سے مخلوقِ خدا کو ایمان کی دولت سے آشنا کر کے ان کی روحانی تسکین کا سامان کیا۔ دینِ اسلام کے تحفظ اور ترویج و اشاعت میں محدثین، فقہاء اور صوفیہ، تینوں طبقات کا کردار آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ یہ وہ تناظر ہے جس میں تمام روحانی سلاسل کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ برصغیر کے معروف روحانی سلاسل کے مزاج کا ادراک کئے بغیر ان کی خدمات کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

حضرت باقی باللہ (۱۵۶۴-۱۶۰۳ء) کی آمد سے پہلے ہندوستان میں جو روحانی سلاسل قادریہ، سہروردیہ اور چشتیہ مقبول و مشہور تھے وہ تمام کے تمام ایران اور ایران کی علمی سرحد عراق کی پیداوار تھے۔ ان تینوں سلسلوں میں جزوی اور فروعی اختلافات تو تھے لیکن ان کا روحانی پس منظر اور مزاج ایک ہی جیسا تھا، ان تینوں سلسلوں میں وحدۃ الوجود کا طریقہ رائج تھا۔ ان روحانی سلاسل میں دیگر سلاسل کی بنسبت بین المذاہب ہم آہنگی کی صلاحیت زیادہ ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ برصغیر میں آغازِ اسلام کے وقت ان سلاسل کے مزاج نے فروغ اسلام میں اہم کردار ادا کیا۔ ان روحانی سلاسل نے دعوت و تبلیغ کے میدان میں کئی نئے تجربات کئے۔ ان سلاسل کے بزرگوں نے وقت اور حالات کے زیر اثر اس طرح کے ''تبلیغی اجتہادات'' فرمائے جس کے نتیجے میں دیگر قوموں سے مسلمانوں کی سماجی اور معاشرتی سطح پر ہم آہنگی میں زبردست اضافہ ہوا۔ ذات پات کے نظام میں جکڑے ہوئے برصغیر میں صوفیہ نے انسانی مساوات کے اسلامی تصور کو اپنے عمل سے اس طرح نمایاں کیا کہ پسے ہوئے طبقوں کے لئے اسلام امید کی آخری کرن بن کر ظاہر ہوا۔

ہندوستانی معاشرے میں جہاں لوگ مذہبی رسومات وعبادات، بھجن اور اشلوک وغیرہ صرف ساز و ترنم کے ساتھ ہی سننے کے عادی تھے، وہاں صوفیہ نے ہندو قوم کو دعوت و تبلیغ کے لئے سماجی سطح پر اپنے قریب رکھنے کے لئے ''قوالی'' کی صورت میں ایک منفرد تجربہ کیا۔ خانقاہی نظام میں ''لنگر خانے'' کے ادارے کو بھی دعوتی نقطہ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جس میں بلا رنگ و نسل اور مذہبی شناخت، لوگوں کی حاجت براری کی جاتی ہے۔ برصغیر میں ہندو اکثریت کے کئی علاقوں میں صوفیہ نے اپنے مریدین کو تلقین کی کہ وہ ہندوؤں کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہوئے گائے کے ذبیحہ سے اجتناب کریں۔ دیگر مذاہب کے بارے احترام کا یہ رویہ صوفیہ کا آزمودہ دعوتی منہج ہے، مذہبی تکثیریت پر مبنی ہندوستانی معاشرے میں اس طریقِ دعوت کے گہرے اثرات کا ہم بآسانی مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ ہماری رائے میں سرزمین ہند میں صوفیہ نے وحدۃ الوجود کی تعبیر خاص مصلحت کے تحت اختیار کی تھی اور یہ بھی ایک طرح کا ''تبلیغی اجتہاد'' ہی تھا جس کے نتیجے ہیں تبلیغ اسلام میں بہت

سہولتیں پیدا ہوئیں۔ ہندو جوگی اور بہت سے ریاضت کرنے والے قدیم ہندو ''ویدانت فلاسفی'' کو ماننے والے جو وحدۃ الوجود کے قائل تھے وہ اس تعبیر کے نتیجہ میں ہی مسلمان ہوئے۔

مذاہب عالم کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مختلف مذاہب کی شریعتیں اگر چہ مختلف ہوتی ہیں، لیکن حکمت کے کئی اعلیٰ اصول بالعموم تمام مذاہب میں مشترک ہوا کرتے ہیں اور یہ اصول اقوام وملل کے درمیان فکری اتحاد اور یگانگت کا باعث بنتے ہیں۔ ایک بالغ نظر داعی، مدعو قوم کے ان اصولوں کو بھلا کیسے نظر انداز کرسکتا ہے جو باہمی قربت کا باعث بن سکتے ہیں۔ سماجی اور مذہبی ہم آہنگی کے ان تمام مظاہر کے باوجود صوفیہ نے اس چیز کا ہمیشہ خیال رکھا کہ مسلمانوں کی مذہبی شناخت پوری طرح برقرار رہے؛ لیکن جس طرح کہ اس طرح کے معاملات میں ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے بعض غیر محتاط صوفیہ، جن کے لئے حضرت مجددؒ نے ''صوفیائے خام'' کی اصطلاح کثرت سے استعمال کی ہے، نے مذہبی رواداری کی آڑ میں اسلامی اور ہندو تصوف میں قائم حد فاصل کو مٹانے کی کوشش کی۔ ہندوستانی معاشرے میں غیر محتاط صوفیہ نے اس طرح کے حالات پیدا کردیے جس سے مسلمانوں کا تشخص خطرے سے دو چار ہونے لگا اور یہ خدشہ حقیقت کا روپ دھارتا ہوا نظر آرہا تھا کہ جس طرح دیگر کئی مذاہب ہندوستانی معاشرے میں ضم ہوکر اپنی شناخت کھو چکے ہیں کہیں مسلمان بھی اپنی مذہبی شناخت سے محروم نہ ہو جائیں۔ یہی وہ دور ہے جب ہندوستان کے افق پر نقشبندی سلسلے کا ظہور ہوا۔ برصغیر میں مختلف روحانی سلاسل کی آمد کے ادوار کو محض اتفاق کہنا شاید درست نہ ہو بلکہ اس میں قضاوقدر کی دخل اندازی کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے، اگر آغاز میں ہی برصغیر میں نقشبندی سلسلے کا ورود ہو جاتا تو شاید ہندوستانی معاشرے میں اشاعتِ اسلام کی رفتار کم رہتی۔ نقشبندیہ کا عمومی مزاج تاریخ علوم میں محدثین کے مماثل ہے جبکہ قادریہ، سہروردیہ اور چشتیہ کا عمومی مزاج فقہاء کے مزاج کے مماثل ہے۔ لیکن جو چیز محسوس کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تکوینی نظام کے مطابق اشاعتِ اسلام کا کام دیگر سلاسل سے لیا اور اسلامیانِ ہند کے اسلامی تشخص کے تحفظ کا کام اس روحانی سلسلے سے لیا جو تاریخ میں مجددی نقشبندی سلسلے کے نام سے معروف ہے۔

ان سطور میں ہمارے پیشِ نظر صرف یہ بتانا ہے کہ اگر چہ برصغیر میں فروغِ اسلام میں عرب تاجروں، مجاہدین اسلام اور مسلم حکمرانوں کی خدمات بھی قابلِ قدر ہیں، لیکن ہندوستان میں اسلام کی جڑیں پاتال تک پہنچانے کا بنیادی کردار صوفیہ کرام نے ہی انجام دیا؛ لیکن اس وقت صوفیہ کرام اور خانقاہی نظام کے نام پر جو جعل سازی ہورہی ہے وہ انتہائی قابلِ افسوس ہے۔ تلخ حقیقت یہ ہے کہ اہلِ تصوّف کی کتب میں تصوّف اور ہے، جبکہ مروجہ تصوف کی شکلیں اس سے بالکل ہٹ کر اور الگ ہیں۔ کوئی صوفی اور پیر جاہل نہیں ہوسکتا، اور نا ہی کسی ایسی خانقاہ کا تصور بھی کیا سکتا ہے جس کے ساتھ مسجد، مدرسہ اور تزکیہ نفس کا مستقل حلقہ موجود نہ ہو۔ علمائے کرام پر لازم ہے کہ وہ مروجہ تصوف پر قرآن وسنّت کی روشنی میں کھل کر تنقید کریں۔ یہ جان لینا ضروری ہے کہ جاہل صوفیہ اور ان کے پھلائے گئے غلط تصوّرات پر علمی تنقید کے بغیر اسلامی تصوّف کا دِفاع ممکن نہیں ہے۔ آج سے ایک ڈیڑھ صدی قبل یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کوئی شخص کسی صوفی سلسلے سے وابستگی کے بغیر دین کی حقیقت سے آشنا بھی ہوسکتا ہے، لیکن پھر جعل سازی نے خانقاہی نظام کے مقدس ادارے کو بری طرح متاثر کیا، جس کی ذمہ داری جعلی صوفیہ اور سجادہ نشین حضرات پر عائد ہوتی ہے۔ علمائے کرام پر لازم ہے کہ وہ صوفیہ کرام کی خدمات، اسلوبِ دعوت اور میدانِ دعوت میں ان کے اجتہادات پر پوری بصیرت سے غور وفکر کریں، تمام سلاسل تصوف کے مزاج کو سمجھیں اور ان کی اصل تعلیمات کو اجاگر کریں۔

۴۔اسلامی جدیدیت اور مابعد جدیدیت:

جدیدیت (Modrenism) اور مابعد جدیدیت (Post Modrenism) اگر چہ مغربی اصطلاحات ہیں لیکن محض تفہیمِ مطلب کے لئے ہم ان اصلاحات کو مسلمانوں کے عہدِ زوال میں جنم لینے والی مختلف علمی اور فکری تحریکوں کے تعارف اور تجزیہ کے لئے استعمال کریں گے۔گذشتہ دو اڑھائی صدیوں میں مسلمانانِ عالم، سیاسی، معاشرتی، معاشی اور علمی واخلاقی سطح پر زوال کا شکار ہیں، فکری انحطاط کے اس دور میں ایسے افراد اور گروہوں نے جنم لیا، جنہوں نے اسلامی نصوص کی تعبیر وتشریح میں بالکل آزادانہ نقطہ نظر اختیار کیا۔مغربی فکر وفلسفہ سے ذہنی مرعوبیت کے شکار جن اہلِ علم نے مغربی اصولوں کی روشنی میں اسلام کی ''تشکیلِ جدید'' کا بیڑا اٹھایا، ان میں سرسید احمد خان (م۱۸۹۸ء) اور ان کے رفیقِ کار مولوی چراغ علی (م۱۸۹۵ء)، فرقہ اہلِ قرآن کے بانی مولوی عبداللہ چکڑالوی (م۱۹۱۴ء)، خواجہ احمد الدین امرتسری (م۱۹۳۶ء)، حافظ محمد اسلم جیراج پوری (م۱۹۵۵ء)، علامہ عنایت اللہ المشرقی (م۱۹۶۴ء)، نیاز فتح پوری (م ۱۹۶۶ء)، علامہ غلام احمد پرویز (م۱۹۸۵ء)، ڈاکٹر فضل الرحمٰن (م ۱۹۸۸ء)، مولانا جعفر شاہ پھلواری (م ۱۹۸۸ء)، علامہ حبیب الرحمٰن کاندھلوی (م۱۹۹۱ء) اور عمر احمد عثمانی (م۱۹۹۶ء) وغیرہ اسلام میں جدیدیت کے حوالے سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔عالمِ عرب میں ڈاکٹر احمد امین مصری (م۱۹۵۴ء) محمود ابوریّہ اور جامعہ ازہر کے استاذ شیخ محمد شلتوت بھی اسی گروہ میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔

مابعد جدیدیت کی اصطلاح کے ذیل میں علامہ شبلی نعمانی (م۱۹۱۴ء)، علامہ حمید الدین فراہیؒ (م۱۹۳۰ء) اور مولانا امین احسن اصلاحی (م ۱۹۹۷ء) قابلِ ذکر ہیں۔دورِ حاضر میں محترم جاوید احمد غامدی اس مکتبِ فکر کی نمائندگی کر رہے ہیں، جبکہ بعض اہلِ علم نامور محقق اور دانشور جناب ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر کو بھی فراہی مکتبِ فکر کا نمائندہ خیال کرتے ہیں۔ بہرحال یہ وہ لوگ ہیں جو روایت پسند اور جدیدیت پسند طبقے میں پل کا کردار ادا کر رہے ہیں اور بے چارے پل کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کسی طرف بھی شمار نہیں ہو پاتا، اور اس کا تعارف بھی بالآخر ایک مستقل گروہ کے طور پر ہی کیا جانے لگتا ہے۔اس کے علاوہ مسلم معاشروں کے اندر کئی ایسے اہلِ علم اور تحریکوں نے بھی جنم لیا، جنہوں نے روایت کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے تئیں عصری تناظر میں اسلام کی تعبیر وتشریح کا بیڑا اٹھایا۔ عالمِ عرب میں اخوان المسلمون کے بانی حسن البناء شہیدؒ اور پاکستان میں جماعتِ اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰؒ (م۱۹۷۹ء) نے اسلام کے ہمہ گیر غلبے کے لئے اسلام کی جدید سیاسی تعبیر پیش کی۔پہلی جنگِ عظیم میں ترکوں کی شکست اور خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد مغربی استعمار کے ردِعمل میں سیاسی تحریکوں کے ساتھ جہادی تحریکوں نے بھی جنم لیا، ردِعمل کی نفسیات لے کر پروان چڑھنے والی جہادی تحریکوں کے پلیٹ فارم سے اسلام کے تصورِ جہاد کی بعض ایسی تعبیرات بھی سامنے آئیں جن پر راسخ العقیدہ علماء بھی شدید تحفظات رکھتے ہیں، اس حوالے سے القاعدہ اور داعش وغیرہ کے تصورِ جہاد کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

علمائے کرام کے لئے لازم ہے کہ وہ اس نوعیت کی فکری بحثوں سے گہری واقفیت حاصل کریں، اور فکری کشمکش کے اس ماحول میں اسلام اور اہلِ اسلام کے حوالے سے جو سوالات اٹھ رہے ہیں ان کو ایڈریس کریں۔ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ نئی نسل جس ماحول میں پروان چڑھ رہی وہ بے لگام عقل پرستی کا دور ہے۔اب وہ دور نہیں ہے کہ جب علمائے کرام پر اعتماد کا یہ عالم تھا کہ صرف مسئلہ بتا دینا کافی سمجھا جاتا تھا، بلکہ اب لوگ مسائل کو دلائل کے ساتھ جاننا چاہتے ہیں۔مزید یہ کہ مغربی تہذیب نے مسیحیت کو چاروں شانے چت کر کے اپنی برتری منوائی ہے اور مذہب کو انسان کی اجتماعی زندگی سے خارج

کرکے اس کو انسان کا نجی معاملہ قرار دے دیا ہے۔آج کا نوجوان مغرب کی ان کامیابیوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے،اور ان اسباب سے بھی آگاہ ہے جن کی بدولت ان کو یہ کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔اس ماحول میں نئی نسل کے سوالات سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا،فتوے سے زبان تو بند کی جاسکتی ہے،لیکن ذہن کو سوچنے سے نہیں روکا جاسکتا۔جدید ذہن میں مذہب کے بارے میں جو شکوک وشبہات پیدا ہو چکے ہیں، ان کا جواب اس پس منظر کو جانے بغیر ممکن نہیں ہے جس میں ان سوالات نے جنم لیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مغربی فکر وفلسفہ کے عالم گیر غلبے کے بعد خود مذہب کے حوالے سے جن نئے سوالات نے جنم لیا ہے ان کا کوئی جواب مدارس کے روایتی نصاب کی بنیاد پر دینا مشکل ہورہا ہے۔اہلِ مذہب نے مذہب سے متعلق اٹھنے والے سوالات سے چشم پوشی کا جو رویہ اختیار کررکھا ہے اس سے یہ تاثر پیدا ہورہا ہے کہ مذہب کے پاس ان سوالات کا کوئی جواب سرے سے موجود ہی نہیں۔اس رویے کے بعض نتائج واثرات ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں کہ نئی نسل تیزی کے ساتھ تہذیبی ارتداد کا شکار ہورہی ہے۔حال یہ ہے کہ مسلم معاشروں کے اندر ایک طبقہ تو وہ ہے جو غیر علانیہ طور پر مذہب سے دستبرداری اختیار کرچکا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ مذہب کا اب انسانی زندگی میں کوئی کردار باقی نہیں رہا،جبکہ دوسرا طبقہ اپنے آپ کو ان اہلِ تجدد سے وابستہ کررہا ہے جو ان کے سوالات کو ایڈریس کرتا ہے اور وہ ان کو مطمئن کرنے میں کوشاں ہے۔علمائے کرام پر لازم ہے کہ وہ مذہب کو درپیش ان چیلنجز کا ادراک کریں اور فتوے کی زبان میں بات کرنے کی بجائے عقلی اور فطری دلائل کے ساتھ مذہب کی ضرورت واہمیت کو ثابت کریں۔اہلِ تجدد میں سے جن افراد یا جماعتوں سے جو علمی اور فکری غلطیاں ہوئی ہیں،فتویٰ بازی کے بجائے ان کا علمی اور فکری محاذ پر تعاقب ضروری ہے، بصورتِ دیگر نئی نسل کو فکری پراگندگی اور تہذیبی ارتداد سے بچانا ممکن نہیں ہوگا۔

دعوتِ دین میں درپیش شخصی چیلنجز:

۱۔عزت واحترام کی بحالی:

علمائے کرام ہر دور میں معاشرے کا ایک معزز طبقہ شمار ہوتے رہے ہیں للیکن اس وقت زمینی حقائق یہ ہیں کہ علمائے کرام اپنا مقام تیزی سے کھو رہے ہیں۔ایک وقت وہ تھا جب مولوی،مولانا اور علامہ جیسے الفاظ باعثِ عزت سمجھے جاتے تھے،اور کسی شخص کے نام کے ساتھ ان القابات کا لکھا جانا اس کے علمی اور سماجی قد کاٹھ کی علامت سمجھا جاتا تھا۔مولانا ظفر علی خان،مولانا الطاف حسین حالی،بابائے اردو مولوی عبد الحق اور تحریکِ خلافت کے روحِ رواں علی برادران سمیت بیسیوں اہلِ علم کے ناموں کے ساتھ ان القابات کا بولا جانا ان الفاظ کی حرمت وتقدس کی دلیل ہے،لیکن اب یہ الفاظ اپنی قدر و قیمت کھو چکے ہیں۔مدارسِ دینیہ کے فضلاء بھی اب مولوی کہلوانا پسند نہیں کرتے۔یہ بات بھی کم تشویشناک نہیں کہ سوسائٹی کے مقتدر طبقات مسجد،مدرسے اور دین سے اپنی محبت اور وابستگی کا اظہار تو ضرور کرتے ہیں اور دینی مقاصد کے لئے رقم بھی خرچ کرتے ہیں،لیکن اپنی اولاد کو دین کی راہ میں دینے سے ہچکچاتے ہیں۔اس وقت دینی مدارس میں پڑھنے والے زیادہ تر طلبہ کا تعلق ایسے غریب گھرانوں سے ہے جو ان کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہیں یا پھر ایسے خاندانوں سے ہے جو پہلے سے اپنی الگ اور مستقل مذہبی شناخت رکھتے ہیں۔اس صورتِ حال میں سیاسی گھرانوں کی طرح مذہبی گھرانوں اور ایسے سجادہ نشینوں کا طبقہ وجود میں آچکا ہے جن کا مقصد مذہب کے نام پر عوام الناس کا استیصال ہے، کسی ذاتی صلاحیت کی بجائے محراب ومنبر کا وراثت میں منتقل ہونا اور ایک ہی خانقاہ پر سجادہ نشینوں کی فوج ظفر موج کا معرضِ وجود میں آنا ایک ایسی خوف ناک حقیقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں ہے۔یہ ایک بڑی وجہ ہے جس نے دینی قیادت کو بے توقیر کرکے رکھ دیا ہے۔بقول اقبال۔

میراث میں آئی ہے انھیں مسند ِ ارشاد
زاغوں کے تصرّف میں عقابوں کے نشیمن

دعوتِ دین کو خاندانی پیشے اور کاروبار کے طور پر اختیار کرنے کا نتیجہ اور ردِعمل بھی عوامی سطح پر دیکھا جاسکتا ہے کہ معاشرے کا پڑھا لکھا طبقہ حق پرست علمائے کرام کو بھی ''کاروباری'' سمجھنے لگا ہے۔

علمائے کرام اور داعیانِ اسلام کا وہ طبقہ جنہوں نے اس میدان کو ایک مشن کے طور پر اختیار کیا ہے ان کے مسائل البتہ دوسرے ہیں۔ اپنی نیک نیتی اور اخلاص کے باوجود ایسے علماء کا دائرہ اثر بھی تیزی سے کم ہو رہا ہے۔ اس صورتِ حال کے اسباب بالکل ظاہر ہیں، ہماری رائے میں اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ اس وقت عمومی طور پر اسلام کی جو تبلیغ ہو رہی ہے اس کے غالب حصے کا تعلق شمائل وفضائل اور ہمارے مرنے کے بعد کے معاملات سے ہے، جس سے یہ تاثر بن رہا ہے کہ دین محض جینے مرنے کے چند رسوم وآداب پر عمل پیرا ہونے کا نام ہے اور بس، ہماری دنیوی زندگی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام کو عام طور پر صرف مرحومین کو بخشوانے کے لئے ہی زحمت دی جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں اس کا دوسرا سبب قرآن وسنّت کا تقلیدی مطالعہ ہے، سنجیدہ فکر علمائے کرام بھی اکابر کی فقہی آراء اور کلامی تعبیرات کو عملاً منزل من اللہ کے درجے میں ہی شمار کرتے ہیں اور براہِ راست قرآن وسنّت کا مطالعہ کرنے کی بجائے اکابر کی اجتہادی آراء کی روشنی میں قرآن وسنّت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ علمائے کرام کا یہ اندازِ فکر اس وجہ سے قابلِ اصلاح ہے کیونکہ قرآن وسنّت پر براہِ راست اور تواتر کے ساتھ غور وفکر کے نتیجے میں جو بصیرت پیدا ہوتی ہے انسان اس سے محروم ہو جاتا ہے۔

ہماری رائے میں علمائے کرام کی اثر پذیری میں کمی کا سبب یہ بھی ہے کہ اسلام کا بہت گہرا اور براہِ راست تعلق ہماری معاشی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی سے ہے، لیکن علمائے کرام کی ایک بڑی تعداد جیتے جاگتے اور معاشرے کے زندہ موضوعات (Current issues) پر عصری تناظر میں گفتگو کرنے سے قاصر ہے۔ ہماری رائے میں اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس وقت جدید تعلیمی اداروں سے جو نسل تیار ہو کر نکل رہی ہے ان کی سوشل سائنسز پر تو نظر ہے؛ لیکن ان کا دینی علم انتہائی کمزور ہے اور دوسری طرف جو نسل روایتی دینی اداروں سے فارغ التحصیل ہو رہی ہیں ان کا حالات حاضرہ، جدید معاشی، سیاسی اور عمرانی علوم سے تعارف نہ ہونے کے برابر ہے، عالمی قانون، عرف، رسم ورواج اور مغربی فکر وفلسفہ تو ان کے لئے قطعاً اجنبی چیزیں ہیں۔ ملک میں پڑھے لکھے طبقے کی دو مستقل جماعتیں قائم ہوگئیں ہیں، ایک طبقہ دوسرے پر فسق والحاد اور بے دینی کا الزام عائد کرتا ہے، تو دوسرا اس پر تاریک خیالی اور زمانے سے ناواقفیت کی پھبتیاں کستا ہے۔ مسٹر اور ملا کے طنزیہ ناموں سے قائم ان طبقوں میں کشمکش مسلسل بڑھتی چلی جارہی ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ مدارسِ دینیہ کے نظام و نصاب میں کسی خارجی دباؤ کے بغیر از خود ایسی تبدیلیوں کو بروئے کار لایا جائے جس کے نتیجے میں علمائے کرام کی ایک ایسی کھیپ تیار ہو جو عصری موضوعات پر علمی انداز میں گفتگو کر سکے۔ انسانیت نوازی، وسعت علمی اور ذاتی کردار ہی علمائے کرام کی عزت ووقار اور معاشرتی کردار کی بحالی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

۲۔ علمی تراث سے واقفیت:

قوموں کے عروج وزوال میں علم اور اخلاق کا کردار بنیادی نوعیت کا رہا ہے۔ اسلام میں پہلی وحی کا آغاز ہی ''اِقرَا'' سے ہوا۔ مسلمانوں کے عروج میں ان کے اخلاق وکردار کے ساتھ علم وتحقیق سے ان کی والہانہ محبت نے اہم کردار ادا کیا، اور پھر تحقیق وجستجو کے میدان میں تنزلی نے ہی ان کے عروج کو زوال آشنا کیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور کی متمدن تہذیبوں سے بھرپور استفادہ کیا اور ان علوم کا اس انداز

میں ''تزکیہ'' کیا کہ مسلمانوں کے ایجاد کردہ علوم وفنون پوری انسانیت کی اجتماعی ترقی کی بنیاد بن گئے۔ مسلمانوں کی تحقیقات کے نتیجے میں مشرق ومغرب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا، اقوامِ عالم بالخصوص مغرب نے علمی میدان میں مسلمانوں سے خوب اخذ واستفادہ کیا۔ ہلاکو خان کے حملہ بغداد ۱۲۵۸ء تک مسلم فکر میں زبردست ارتقاء نظر آتا ہے۔ بغداد کی تباہی سے نہ صرف مسلمانوں کی صدیوں کی علمی ترقی اور ذہنی ریاضت دریا برد ہوگئی بلکہ کئی نامور علماء بھی تاتاری تلوار کی نذر ہوگئے، اور ۱۴۹۲ء میں سقوط غرناطہ کے بعد مسلم فکر کے تقریباً تمام علمی سرچشمے خشک ہوگئے۔ مسلمان علمی میدان میں اجتہاد کے بجائے تقلید کا شکار ہو گئے اور علمی روایت آہستہ آہستہ مکمل طور پر مغرب کی طرف منتقل ہوگئی۔ اگر چہ ان دو بڑے حادثات کے بعد بھی مسلمانوں کو سیاسی عروج حاصل رہا، لیکن فکری اور علمی اعتبار سے یہی مسلمانوں کا دورِ انحطاط ہے۔

درس نظامی کے روایتی نصاب پر ایک نظر ڈالنے سے ہی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مدارس دینیہ کے نصاب میں شامل اکثر کتب اور علوم وفنون اسی دور زوال کی یادگار ہیں جب مسلمانوں کا علمی انحطاط شروع ہو چکا تھا اور مسلم فکر پر جمود کے سائے پڑنا شروع ہوگئے تھے۔ جب کہنے کو کچھ باقی نہ رہا تو غیر منقوط کتب نویسی ہی کمالِ فن قرار پایا، نئے علوم وفنون اور زندہ موضوعات پر غور وفکر کی بجائے ایسی کتابیں منصۂ شہود پر آنے لگیں، جن میں اختصار نویسی، لفظی بحثوں اور لفظی موشگافیوں کو ہی کمال فن سمجھا جانے لگا۔ بڑا کمال یہی سمجھا گیا کہ عبارت ایسی دقیق اور غامض ہو جس کے لئے شرح وحاشیہ کی ضرورت ہو، لطیفہ یہ ہے کہ بعض اصحابِ علم نے ذہنی عیاشی کی خاطر انتہائی مختصر کتب تصنیف کیں۔ اور پھر خود ہی ان پر طویل حواشی لکھنے بیٹھ گئے، اور اب ہمارے مدرسین اپنی عمر عزیز کا زیادہ حصہ انہی دقیق عبارتوں کے سمجھنے اور سمجھانے میں گزار دیتے ہیں۔ مصنف کی مراد، ضمائر کے امکانی مراجع اور عبارت کی اعرابی حالتوں کے ایسے خیالی پلاؤ پکائے جاتے ہیں کہ بسا اوقات ایسی بحثوں میں کئی کئی ہفتے گزر جاتے ہیں اور نتیجہ پھر بھی غیر حتمی ہی رہتا ہے۔ گویا فن میں مہارت کے بجائے کتاب کی تفہیم حقیقی مقصد بن کر رہ گئی ہے۔ علم وتحقیق میں زوال کے ساتھ ہی ہماری علمی روایت اور علمی میراث بھی مغرب کی طرف منتقل ہو گئی۔ بقول علامہ اقبال:

وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی
دیکھا ان کو جو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

عام طور پر درس نظامی کی تکمیل پر فرض کرلیا جاتا ہے کہ علم کی تکمیل ہوگئی ہے، حالانکہ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ درسیات کی تکمیل سے انسان صرف ایک سچا طالب علم بننے کی صلاحیت حاصل کر پاتا ہے۔

علمائے کرام کو اس حقیقت کا ادراک کرنے کی ضرورت ہے کہ علم کے جدید وسائل اور ذرائع نے نئی نسل کو بہت باخبر بنا دیا ہے، جدید عمرانی علوم میں گہری بصیرت کے بغیر اسلام کی عصری احوال وظروف میں تبلیغ ممکن نہیں ہے۔ طبقہ علماء میں موجود ''العوام کالانعام'' کے دقیانوسی تصور کو اب تبدیل کرلینا چاہیے۔ علمائے کرام کے لئے ضروری ہے کہ وہ علمی اختلافِ رائے کے باوجود متقدمین کے ساتھ ساتھ دورِ جدید کے نامور علماء اور شخصیات کی فکر کا مطالعہ کریں اور ان کی اہم کتب پڑھ ڈالیں، نیز مختلف موضوعات مثلاً سوشل سائنسز پر منتخب کتب کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اس چیلنج سے نبرد آزماء ہونے کے لئے مطالعہ کی کمی مخصوص ذہنیت کے ساتھ مطالعہ کا ذوق، متشددانہ رویے، جذباتیت، سطحیت جیسی منفی اپروچ کی اصلاح ضروری ہے۔

۳۔ معاشی مسائل:

دنیا میں ایسا کوئی مذہب اور نظریہ کامیاب نہیں ہوسکتا جو روح اور بدن میں سے ایک کو ابھارے اور دوسرے کو کچل دے۔ عیسائیت، ہندومت، بدھ مت، اور دیگر مذاہب کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ انہوں نے ترک دنیا اور رہبانیت کے

تیشے سے انسانی جسم کو صرف اس لیے گھائل کر دیا ہے تا کہ انسانی روح کو بیدار کیا جا سکے؛ لیکن اس غیر طبعی تعلیم اور جان سوزی کے نتیجے میں روح کی شمع بھی گل ہو کر رہ گئی۔ اہل کلیسا نے خانقاہوں میں بسیرا کر لیا، ہندووں اور بدھوں نے جنگلوں کا رخ کر لیا۔ مذاہب عالم میں اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے روح اور جسم دونوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھا، اور انسان کے پیٹ کے مسائل کو ایک معاشی مسئلے کے طور پر موضوع بنایا۔ مذاہبِ عالم میں اسلام یہ منفرد سوچ رکھتا ہے کہ اس نے خالصتاً روحانی غلطیوں پر بھی مالی جرمانے کی سزا عائد کی ہے، تا کہ ضرورت مندوں کی دادرسی کے ذریعے خدا کی مرضی حاصل کی جا سکے۔ حکم ہے کہ اگر رمضان کا روزہ ٹوٹ جائے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔ قسم ٹوٹنے کی صورت میں تین مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم ہے۔ اپنی بیوی سے ظِہار کی صورت میں ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم ہے۔ حتی کہ قتل جیسے سنگین معاملے میں مقتول کے ورثاء ضرورت مند ہوں تو وہ دیت پر صلح کر سکتے ہیں۔ دیت پر صلح کے امکان کو تسلیم کیا جانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام نے انسان کے معاشی مسائل کے حل کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ایک پہلو سے اس کو دین اور ایمان کی مضبوطی کے لیے اساس قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان معاشی مسئلے کی اہمیت کو واضح کرتا ہے:

كَادَ الفَقرُ اَن يَّكُونَ كُفراً ۔(11) قریب ہے کہ تنگدستی انسان کو کفر تک پہنچا دے۔

اس ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ داعیانِ اسلام کو ایک طرف تو یہ چیلنج درپیش ہے کہ وہ دین کی دعوت کا کام ایک مشن کے طور پر کریں اور دوسری طرف ضروریاتِ زندگی سے بھی صرفِ نظر ممکن نہیں ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں دیکھا جا سکتا ہے کہ مسلم معاشروں میں دین کی دعوت و تبلیغ کو عوامی سرپرستی کے ساتھ ریاست کی معاونت بھی حاصل رہی ہے، لیکن اب کم از کم برصغیر کی حد تک ریاست علمائے کرام کی معاشی ضروریات کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ان حالات میں مدارس کے مہتمم حضرات سے ہی یہ گزارش کی جا سکتی ہے کہ وہ حالاتِ حاضرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے نصابِ تعلیم میں شعوری طور پر ایسی تبدیلیاں بروئے کار لائیں جو باعزت روزگار کی ضمانت بن سکیں۔ آج مارکیٹنگ کا دور ہے، اس دور میں علمائے کرام کے لئے ایسی ورکشاپس کا انعقاد وقت کی ضرورت ہے، جو ان کے لئے درست میدانِ عمل (ملازمت، تدریس، خطابت، کاروبار، وغیرہ) کے لیے معاون ہوں۔

مصادر و مراجع

(۱) النحل، ۶۱/۵۲۱۔ (۲) ال عمران، ۳/۴۶

(۳) احمد بن حنبلؒ، ابو عبداللہ الشیبانی، الامام (م ۲۴۱ھ) ۴۔ ''المسند''، حدیث زید بن ثابتؓ، ح: ۲۳۸۶، ۱۱۰۸ (دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۱)۔ (۵) ابو داودؒ، سلیمان بن الاشعث بن اسحاق السجستانی، ''سنن ابی داود''، کتاب الطلاق، باب من احق بالولد، ح: ۲۲۷۷، ص: ۲۳ (دار السلام للنشر والتوزیع، ۱۹۹۱ء)

(۶) سرخسی، ابو بکر محمد بن احمد بن ابی سہل، (م ۴۹۰ھ)، ''المبسوط'' کتاب الصلوۃ، ۱/۳۷، (دار المعرفۃ، بیروت، ۱۹۷۸ء) (۷) حمید اللہ، ڈاکٹر، (م ۲۰۰۲ء)، ''صحیفہ ہمام بن منبہ''، ص ۱۹۳، (ناشر رشید اللہ یعقوب، کلفٹن، کراچی، ۱۹۹۸ء) (۸) ابن سعد، ابو عبد اللہ محمد، (م ۲۳۰ھ)، ''الطبقات الکبری'' ذکر بعثۃ رسول اللہ ﷺ الرسل بکتبہ الی الملوک، ۱/۲۵۸، (دار صادر، بیروت، ۱۹۸۵ء)۔

(۹) ''المسند''، حدیث عبداللہ ابن مسعودؓ، ح: ۳۷۵۲۔۶۵۴۱)۔ (۱۰) ''الطبقات الکبری''، وفد تمیم، ۱۴۲۱۔ (۱۱) ''الطبقات الکبری''، ذکر نقش خاتم رسول اللہ ﷺ، ۲۳۲۱۔ (۱۲) خطیب التبریزی، مشکوۃ المصابیح، رقم الحدیث ۴۹۷۹۔

(بشکریہ ماہنامہ الشریعہ، پاکستان، مئی ۲۰۲۰ء)

☆☆☆

❑ اصلاح وتذکیر

اپنی اصلاح کے ساتھ گھر والوں کی اصلاح کے لیے کوشش ضروری ہے

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

ارشادِ الٰہی ہے: یا ایھا الّذین آمنوا قوا انفسکم و اھلیکم ناراً وقودھا الناس و الحجارۃ (التحریم:۶/۶۶)

(اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ جس کے ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے)

یہ آیت اس لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں مومنین کو ایک انتہائی اہم ہدایت (جس پر انسان کی حقیقی کامیابی کا دارومدار ہے) دی گئی ہے اور وہ ہے اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو نارِ جہنم سے بچانے کی فکر و کوشش کرنا۔ بلاشبہ جہنم سے دور ہونا اور جنت نصیب ہونا ہی انسان کی اصل کامیابی ہے، جیسا کہ ارشاد ربّانی ہے: فمن زحزح عن النار و أدخُل الجنۃ فقد فاز (آل عمران:۳/۱۸۵) [جو جہنم سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہی (حقیقی معنوں میں) کامیاب ہوا]۔ ظاہر ہے کہ جنت نصیب ہونا منحصر ہے روزمرہ زندگی میں اللہ رب العزت اور رسول کریم ﷺ کی مخلصانہ اطاعت پر۔ آیت کا پیغام بہت ہی واضح ہے کہ اہلِ ایمان حکمِ الٰہی وسنتِ رسول ﷺ کے مطابق اپنے حالات سدھاریں، زندگی کے ہر شعبہ میں دین کے تقاضوں کو پورا کریں اور اسی طور پر اپنے گھر والوں کی اصلاح کے لئے پوری کوشش کریں۔

اس آیت کی تشریح سے متعلق یہ روایت بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اس کے نزول پر حضرت عمر ابن خطابؓ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! اپنے آپ کو کیسے جہنم سے بچائیں، یہ تو سمجھ میں آ گیا (کہ احکامِ الٰہی پر عمل کریں اور گناہوں سے دور رہیں)، مگر ہم اپنے اہل وعیال کو کس طرح جہنم سے بچائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جن کاموں سے منع فرمایا ہے، اہل وعیال کو ان کاموں سے منع کرو اور اللہ نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے، ان کے کرنے کا انہیں حکم دو تو یہ عمل ان کو جہنم کی آگ سے بچائے گا (سید محمود الآلوسی، روح المعانی، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر، بدون تاریخ، ۲۸/۱۵۶)۔

صاحبِ تفہیم القرآن نے اس آیت کی تشریح میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص کی ذمہ داری صرف یہ نہیں ہے کہ اپنی ذات کو اللہ کے عذاب سے بچانے کی کوشش کرے، بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ جس خاندان کا وہ سربراہ ہے اس کو بھی ممکن حد تک ایسی تعلیم وتربیت دے کہ وہ احکامِ الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرنے والا بن جائے، تاکہ اللہ رب العزت اس سے راضی ہو جائے اور وہ جہنم سے بچ جائے (سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۷ء، ۶/۲۹-۳۰، حاشیہ نمبر-۱۶)۔

قرآن کریم میں نبی آخر الزماں ﷺ کی امت کو ''خیر امۃ'' کے لقب سے مشرف کیا گیا ہے اور یہ بھی واضح کردیا گیا کہ یہ شرف واعزاز مُرتبط ہے ایک بہت بڑی ذمہ داری (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) سے (آل عمران: ۳/ ۱۱۰)۔ سورۃ التوبۃ کی آیت ۷۱ میں مومن مردوں اور عورتوں کے امتیازی اوصاف میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے باہم رفیق ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نماز کا اہتمام کرتے ہیں، زکوٰۃ کی ادائیگی کے پابند ہیں اور اللہ واس کے رسول کی اطاعت میں سرگرم رہتے ہیں۔ اس آیت سے یہ نکتہ اخذ ہوتا ہے کہ رفاقت ودوستی اور بھائی چارگی کے تقاضے میں سے یہ ہے کہ ایک دوسرے کو نیکی کی دعوت دی جائے اور برے کام سے دور رکھا جائے، یعنی اسے راہِ حق پر چلانے کی کوشش کی جائے۔ مزید براں حدیث میں دین کو سراپا ''نصیحۃ'' (خیر خواہی) سے تعبیر کیا گیا ہے: الدین النصیحۃ (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان اَنّ الدین النصیحۃ)۔ اس سے بڑھ کر کسی کی خیر خواہی اور کیا ہوسکتی ہے کہ اسے نیکی کی راہ پر چلانے اور برے کاموں سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ سورۃ العصر ایک مختصر؛ لیکن مضمون کے لحاظ سے جامع ترین سورہ ہے۔ اس میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ کس کو حقیقی نفع نصیب ہوگا اور کون خسرانِ عظیم سے دوچار ہوگا۔ اس کے مطابق وہ لوگ خسران سے محفوظ رہیں گے جو ایمان وعملِ صالح کے ساتھ ''تواصی بالحق'' اور ''تواصی بالصبر'' سے شغف رکھتے ہیں۔ مولانا عبدالباری ندوی فلسفیؒ اس سورہ کی تشریح پر مبنی اپنی کتاب '' قرآن کا دو آیاتی نظامِ صلاح و اصلاح'' میں رقم طراز ہیں: ''انسان کو بحیثیت مجموعی خسران سے بچانے کے لئے صرف کچھ افراد کا اپنی اپنی جگہ ''آمنوا وعملوا الصلحت'' کا حق ادا کر کے مومن صالح بن جانا کافی نہیں، بلکہ ایمان وعمل صالح کی اس حقّانی زندگی کو پوری نوع انسانی میں پھیلانے اور پیدا کرنے کے لئے آپس میں ایک دوسرے کو اس کی فہمائش وتاکید کرتے رہنا بھی لازم ہے'' (عبدالباری ندوی، قرآن کا دو آیاتی نظامِ صلاح واصلاح، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰۶)۔

زیر مطالعہ آیت میں ''اہل'' کو نارِ جہنم سے بچانے کا حکم دیا گیا ہے یعنی اپنی اصلاح کے ساتھ ''اہل'' کی اصلاح کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لفظ ''اہل'' سے کون لوگ مراد ہیں۔ اس آیت کے علاوہ دیگر متعدد آیات میں یہ لفظ آیا ہے اور مختلف معانی (بیٹا، اولاد، بیوی، افرادِ خانہ، گھر والے، اہلِ خاندان) میں استعمال ہوا ہے۔ ان سب آیتوں پر غور وفکر کا ماحصل یہ ہے کہ اس کا عمومی اطلاق ان تمام افراد پر ہوتا ہے جو ایک ساتھ کسی گھر میں رہتے ہیں، اردو میں اس کی جامع وعام فہم تعبیر ''گھر والے/گھر والوں'' سے کی جاتی ہے۔ اہم بات یہ کہ بیشتر اردو مترجمینِ قرآن نے ''اہل'' کا ترجمہ گھر والوں یا اہل وعیال کیا ہے۔ اور بعض مفسرین کی رائے میں ''اہل'' کے دائرہ میں غلام، مستقل ملازمین وخادمین کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے (معارف القرآن، مکتبۂ مصطفائیہ، دیوبند، ۸/ ۵۰۲)۔ بہر حال قرآن ہمیں یہی سبق دیتا ہے کہ ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' ہو یا ''تواصی بالحق''، اس ذمہ داری کی انجام دہی سب سے پہلے اپنے گھر والوں کی نسبت سے مطلوب ہے، جیسا کہ محولہ بالا آیت میں اس کی تاکید کی گئی ہے۔

اسی ضمن میں یہ بات بھی لائقِ توجہ ہے کہ زیرِ بحث آیت میں اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم سے بچانے کے لئے ''امر'' کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، یعنی تاکید کے لئے جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے اس نے اس کام کو فرض کا درجہ دے دیا ہے۔ مقصود یہ کہ اپنی اور گھر والوں کی اصلاح کے لئے کوشش محض مطلوب نہیں، بلکہ ضروری ہے۔ آیت میں جہنم کی آگ کے بھڑکنے کے ذرائع ذکر کر کے اس کام (نارِ جہنم سے

بچانے) کی ضرورت واہمیت کواور بڑھادیا گیا ہے۔ سچ پوچھئے تو اس سے بڑھ کر ضروری واہم کام اور کیا ہوسکتا ہے کہ اپنے کو اور گھر والوں کو حقیقی کامیابی سے ہم کنار کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ اس آیت کی تشریح میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے بجا تحریر فرمایا ہے: ''ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچانے کے لئے جو کچھ کرسکتا ہے اسے اٹھائے نہ رکھے۔ جب بھی دیکھے کہ ان کے اندر اللہ کی شریعت سے بے پروائی راہ پارہی ہے، فوراً اس کے سدِّ باب کی فکر کرے'' (تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۸۵ء، ۸/۴۶۹)۔

مذکورہ بالا آیت کے اصل مخاطب کون لوگ ہیں، یعنی گھر والوں کو جہنم سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری کس کی ہے؟ مفسرین و ماہرینِ قرآنیات عام طور پر اس کا مخاطب گھر کے سرپرست ونگراں کو قرار دیتے ہیں، یعنی گھر کے لوگوں کی اصلاح یا ان کے احوال کی درستگی کی ذمہ داری اصلاً گھر کے نگراں وسرپرست یا بڑے بوڑھوں کی ہے کہ وہ گھر کے لوگوں کو سمجھائیں، انہیں دین کی باتیں بتائیں، اچھے کاموں کی طرف توجہ دلائیں اور برے کاموں پر انھیں متنبہ کرتے رہیں۔ اس ضمن میں وہ حدیث بھی نقل کی جاتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ تم میں سے ہر شخص نگراں ہے اور اس سے ان لوگوں کے بارے میں باز پرس ہوگی جو اس کی کفالت ونگرانی میں رہتے تھے (صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللہ تعالیٰ ''اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم'')۔ اس سے انکار نہیں کہ گھر کے لوگوں کی اصلاح یا ان کے حالات درست کرنے یا انھیں راہِ ست پر لانے کی اصل ذمہ داری سرپرست یا نگراں کی ہی ہوتی ہے؛ لیکن آیت میں اپنے اہل و عیال کو نارِ جہنم سے بچانے کا حکم عمومی انداز میں دیا گیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چھوٹے و بڑے، جوان و بوڑھے، مرد وعورت کی تفریق کے بغیر گھر کے تمام لوگوں سے یہ مطلوب ہے کہ وہ موقع ومحل کی رعایت کے ساتھ حسبِ استطاعت ایک دوسرے کو اچھی باتیں بتائیں، نیک کاموں کی طرف متوجہ کریں اور برے کاموں پر متنبہ کرتے رہیں، یعنی یہ سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ دوسرے یہ امر بھی غور طلب ہے کہ کسی کے ''اہل'' میں اس کی اولاد لازمی طور پر شامل ہوتی ہے اور یہ بات محتاجِ وضاحت نہیں کہ اولاد کی اصلاح، ان میں اچھی عادتوں کی پرورش و پرداخت یا انہیں صحیح روش پر چلانے میں سب سے اہم کردار والدین کا ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اولاد کی نسبت سے اصلاحِ احوال کی بنیادی ذمہ داری والدین کی ہی ہوتی ہے۔ اولاد کے آرام و سکون کے لئے والدین تمام ممکن سہولتیں فراہم کرتے ہیں اور ہر قسم (وقت، مالی وسائل، جسمانی قوت و ذہنی صلاحیت) کی قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں، اسی طرح دینی و اخلاقی لحاظ سے ان کی زندگی کو سنوارنا بھی ان کا بڑا اہم وخوش گوار فریضہ ہے۔ اس ضمن میں اس حدیث نبوی ﷺ کا حوالہ بہت برمحل معلوم ہوتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اولاد کے لئے والد کا بہترین تحفہ یہ ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے، بالخصوص انہیں حسنِ ادب کی تعلیم دے۔ حضرت ابن سعدؓ سے مروی نبی کریم ﷺ کے الفاظِ مبارکہ ملاحظہ فرمائیں :ما نحل والد ولداً من نحل افضل من حسنِ ادب۔ (جامع ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ما جاء فی ادب الولد)[کسی والد کا (اپنی) اولاد کے لئے حسنِ ادب سے بہتر کوئی اور تحفہ نہیں ہے]۔

رہا یہ مسئلہ کہ گھر کے لوگوں کو کن باتوں کی خصوصی تاکید کی جائے اور کن اعمال کی انہیں بار بار یاددہانی کرائی جائے، یا گھر پر تذکیری مجالس میں دینی و اخلاقی تعلیمات کے کن پہلوؤں پر زیادہ زور دیا جائے، یقینی طور پر فرض عبادات کی

ادائیگی کی تاکید سب سے مقدم ہے، بالخصوص گھر کے تمام افراد کو نماز کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے اور اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی وغفلت دور کرنے پر خصوصی توجہ دی جائے۔ اس سے ہم سب بخوبی واقف ہیں کہ ارکانِ اسلام میں نماز اول نمبر پر ہے، یہ افضل العبادت ہے اور اللہ رب العزت کو یاد کرنے اور اس سے تعلق مضبوط کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ اہم بات یہ کہ گھر والوں کو اس فریضہ کی ادائیگی کی تاکید کی بابت بعض قرآنی آیات سے رہنما اشارات بھی ملتے ہیں۔ حضرت اسمٰعیلؑ کے امتیازی اوصاف میں یہ بیان کیا گیا کہ وہ اپنے گھر والوں کو نماز کے اہتمام اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیتے تھے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وکان یامر اھلہ بالصلوٰۃ والزکوٰۃ وکان عند ربہ مرضیاً (مریم:۱۹/۵۵) [وہ اپنے گھر والوں کو نماز وزکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور وہ اپنے رب کی نگاہ میں پسندیدہ تھے]۔ حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو شرک سے اجتناب اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی نصیحت کے فوراً بعد اقامتِ صلوٰۃ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے اہتمام کی تاکید کی تھی۔ ارشادِ ربّانی ہے: یا بُنیَّ اقم الصلوٰۃ وأمر بالمعروف وانہ عن المنکر (لقمان:۳۱/۱۷) [اے میرے بیٹے! نماز کا اہتمام کرو، نیکی کا حکم دو اور برائی سے منع کرو]۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر ﷺ کو یہ خصوصی حکم فرمایا: وأمر اھلک بالصلوٰۃ واصطبر علیھا (طٰہٰ:۲۰/۱۳۲) [اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیجیے اور خود اس پر جمے رہئے]۔ آخری آیت کا آخری حصہ اس لحاظ سے بڑا اہم وسبق آموز ہے کہ اس میں نبی کریم ﷺ کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ گھر والوں کو نماز کی تاکید کرتے رہنے کے ساتھ خود بھی اس پر کاربند رہیں۔ اس سے یہ قیمتی سبق ملتا ہے کہ لوگوں کی اصلاح کی راہ میں سرگرم رہنے والوں اور انہیں نیک کاموں کی دعوت دینے والوں کو پہلے اپنے آپ کو ان کا خوگر بنانا نہایت ضروری ہے، ورنہ دعوت وتذکیر بے اثر ہوکر رہ جائے گی۔ سچ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر حکمِ الٰہی کی تعمیل میں سرگرم رہنے والا کون ہوسکتا ہے۔ یہاں نماز کے اہتمام کے باب میں اسوۂ مبارکہ سے متعلق صرف ایک حدیث کا حوالہ کافی معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت کے مطابق نبی کریم ﷺ گھر کے کام وکاج میں لگے رہتے تھے، جیسے ہی نماز کا وقت آجاتا (یا ایک دوسری روایت کے مطابق اذان ہوجاتی) تو آپ ﷺ بلا کسی تاخیر اس کی تیاری میں مصروف ہوجاتے تھے (صحیح بخاری، کتاب الادب، باب کیف یکون الرجل فی اھلہ، صحیح بخاری، کتاب النفقات، باب خدمۃ الرجل فی اھلہ)۔

اسلام، جیسا کہ معروف ہے، مکمل نظامِ حیات سے عبارت ہے، اور قرآن اہلِ ایمان کو یہ ہدایت دیتا ہے کہ پورے کے پورے سلامتی کے راستہ (یعنی اسلام) میں داخل ہوجاؤ (البقرۃ:۲/۲۰۸)۔ اس لئے عبادات کے علاوہ خانگی، معاشرتی ومعاشی (اور دیگر شعبہ ہائے) زندگی سے متعلق بھی قرآنی ہدایات وحدیث کی تعلیمات کی یاددہانی ایک دوسرے کو مسلسل کراتے رہنا چاہیے۔ روزمرہ زندگی سے متعلق امور میں خاص طور سے سلام وکلام، ملاقات، میزبانی ومہمانی کے اصول وآداب، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے کے اسلامی طور وطریق سکھانا، والدین، اولاد، بھائی، بہن، اقرباء، پڑوسی، خادم ومزدور کے حقوق سے واقف کرانا، فضول خرچی، غیر ضروری رسوم وروایات اور بے مقصد کاموں میں وقت کے ضیاع سے پرہیز پر زور دینا اور لین دین کے معاملات میں دیانت داری وشفافیت کی تعلیم دینا، ان سب امور سے متعلق قرآن وحدیث کی تعلیمات پر عمل کی ایک دوسرے کو تاکید کرتے رہنا زیادہ اہم معلوم ہوتا ہے۔ واقعہ یہ کہ زندگی کے ہر پہلو سے متعلق کتاب وسنت کی تعلیمات کے بار بار تذکرے یا ان پر عمل کی یاددہانی کے بغیر انسانی زندگی کی اصلاح کا جامع تصور شرمندۂ

تعبیر نہیں ہوسکتا۔

اسی ضمن میں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تذکیر، نصیحت وفہمائش کے تعلق سے اگر اس وقت کے گھر ومعاشرہ میں کچھ حرکت نظر آتی ہے تو وہ زیادہ تر امر بالمعروف (اچھی باتیں بتانے و نیک کاموں کی ترغیب) میں محدود رہتی ہے، برائیوں یا گناہ کے کاموں پر متنبہ کرنے اور ان سے باز رکھنے کی کوشش کم دکھائی دیتی ہے۔ عام لوگوں سے قطعِ نظر خواص یا علماء میں نہی عن المنکر کے پہلو سے جو غفلت یا بے توجہی پائی جاتی ہے اس پر ایک صوفی صفت عالم کا یہ تاثر صحیح صورتِ حال کی صحیح عکاسی کررہا ہے: ''منکرات پر روک ٹوک کی عادت اہلِ علم میں بھی کم ہوتی جارہی ہے جس کی وجہ سے منکرات پھیلتے جارہے ہیں'' (دعوۃ الحق [پرنام بٹ، ٹامل ناڈو]، مارچ ۲۰۲۰ء، ص ۱۵)۔ سچ بات یہ کہ ''نہی عن المنکر'' کے بغیر ''امر بالمعروف'' کا حق ادا ہی نہیں ہوسکتا، جیسا کہ قرآن کریم میں دونوں کام (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کے ساتھ ساتھ ذکر کے اہتمام سے واضح ہوتا ہے، اور اہلِ ایمان کے امتیازی اوصاف میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔ مزید براں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُس صورتِ حال میں جہاں ہر طرف برائیوں کا بول بالا ہو اور لوگ گناہ کے کاموں کے عادی ہوں گئے ہوں، وہاں نہی عن المنکر کی ضرورت واہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ بلا شبہ موجودہ حالات میں زندگی کے ہر پہلو سے متعلق گھر کے لوگوں کے لئے امر بالمعروف ونہی عن المنکر یا تذکیر وفہمائش کی ضرورت بڑھتی ہی جارہی ہے۔

زیرِ بحث آیت کے تعلق سے ایک اور اہم بات یہ کہ اس میں ''انفسکم'' کو ''اھلیکم'' پر مقدم کرنے کے حوالے سے بعض بزرگ علماء دین نے اصلاح کے کام کی ترتیب کی طرف توجہ دلائی ہے کہ پہلے اپنی تعلیم وتربیت اور اصلاح کی فکر کی جائے تو اولاد، گھر والوں یا دوسروں کی اصلاح کے لئے کوشش آسان ہوگی۔ مزید براں انہوں نے یہ تاثر بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ عام مشاہدہ ہے کہ جو شخص خود اپنی اصلاح کی فکر رکھتا ہے اسے اپنی اولاد ومتعلقین کی اصلاح کی بھی فکر ہوتی ہے، یعنی جو اپنے حالات کو سدھارنے میں سنجیدہ وسرگرم رہتا ہے اس کے لئے دوسروں کی اصلاح کی راہ ہموار ہوجاتی ہے (شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، علم ترقی کا اہم ذریعہ ہے، دعوۃ الحق، اگست ۲۰۱۵ء، ص ۴)۔ اور یہ حقیقت تو اپنی جگہ مسلم ہے کہ اپنے کو سدھارنے کے بعد دوسروں کی اصلاح کے لئے کوشش کی جاتی ہے یا کی جائے تو اس کے خاطر خواہ اثرات مرتب ہوتے ہیں یا ہوں گے۔ یہ آیت اسی نکتہ پر غور وفکر کی دعوت دے رہی ہے: اَتامرون الناس بالبرِّ وتنسون انفسکم (البقرۃ:۲/۴۴) [کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو]۔ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے دوسروں کی اصلاح کے لئے کوشش کی راہ میں قرآنی ترتیب کو اختیار کرنے پر اس انداز میں زور دیا ہے: ''دوسروں کی اصلاح اپنی اصلاح پر مرتب ہوتی ہے، لہذا چاہئے کہ انسان اصلاح کے عمل کا آغاز اپنی ذات سے کرے، پھر اس کے بعد دوسروں کی اصلاح کی کوشش کرے، جو خود درست نہیں ہے وہ دوسرے کو کیسے درست کرے گا'' (ابو حامد الغزالی، احیاء علوم الدین، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۱ء، ۲/۲۸۰)۔

مختصر یہ کہ قرآن وحدیث کا واضح پیغام یہ ہے کہ گھر وخاندان کے لوگ ایک دوسرے کو اچھی باتیں بتاتے رہیں، نیک کاموں کی یاد دہانی کراتے رہیں اور برے کاموں سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ اس کام سے غفلت کا انجام نہ صرف نقصان دہ ہے، بلکہ سب سے بڑے نقصان کا سبب اور موجبِ تباہی ہوسکتا ہے۔ انسان کو اپنے کاموں میں نقصان ہوتا رہتا ہے، جو فطری طور پر اس کے لئے تکلیف وپریشانی کا باعث بنتا ہے۔ کبھی کبھی

اس نقصان کی تلافی بھی ہوجاتی ہے،لیکن اس تحریر کی بنیادی آیت کے پیغام (اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم سے بچانے کی فکر وکوشش) سے غفلت ولاپروائی پر جو نقصان ہوگا یا ہوسکتا ہے وہ سب سے بڑے نقصان کی صورت میں سامنے آئے گا اور مزید توجہ طلب بات یہ کہ اس کی تلافی کی کوئی صورت نہ ہوگی۔قرآن کریم میں اس پہلو سے بھی انسان کو بار بار متنبہ کیا گیا ہے۔ جو لوگ آخرت کی فکر وتیاری سے مسلسل غفلت میں رہتے ہیں، بلکہ اس کے خلاف اعمال ان سے صادر ہوتے رہتے ہیں،انھیں قرآن میں ایک مقام پر یہی حقیقت یاد دلائی گئی ہے۔ارشادِ ربّانی ہے: قل انّ الخٰسرین الّذین خسروا انفسھم و اھلیھم یوم القیٰمۃ اَلا ذٰلك ھو الخسران المبین (الزمر:۳۹/۱۵)[کہہ دیجئے کہ اصل نقصان والے تو وہ لوگ ہیں جو قیامت کے روز اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو خسران کے گھاٹے میں ڈالیں گے، ہوشیار،خبر دار! یہی بالکل کھلا ہوا نقصان ہے]۔

بلا شبہ موجودہ بگڑی ہوئی صورتِ حال میں دینی اجتماعات اور عام دعوتی پروگراموں کے ساتھ قرآن وسنت کی روشنی میں اپنے اور گھر والوں کے حالات سدھارنے،انہیں نیک کاموں کی طرف راغب کرنے اور برائیوں سے دور رہنے کی تاکید کرنے کی ضرورت واہمیت اور بڑھ گئی ہے۔گھر کے ہر شخص سے یہ مطلوب ہے کہ اپنی اصلاح کے ساتھ حسبِ صلاحیت واستعداد حکمت کے ساتھ دوسروں کی اصلاح کے لئے کوشش کرے اور لوگ ایک دوسرے کو اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، ملتے جُلتے اچھی باتیں بتاتے رہیں اور نیک کاموں کی طرف متوجہ کرتے رہیں۔گھر میں اگر کوئی علمِ قرآن وحدیث سے بہرہ ور ہے تو وہ گھر کے لوگوں کو قرآن وحدیث کی تعلیمات سے باخبر کرے، یا پھر دینی کتابوں کی مدد سے ان کی تذکیر کرے اور دینی احکام کے تعلق سے انہیں سمجھائے بجھائے۔بہتر ہوگا کہ کم از کم ہفتہ میں ایک بار خاص گھر کے لوگوں کے لئے تذکیری پروگرام کا نظم جاری کیا جائے اور اس نہایت ضروری ومفید کام کے لئے آدھا، پون گھنٹہ وقت فارغ کرنا اُس ماحول میں کچھ بھی مشکل نہیں جہاں لوگ بہت سے غیر ضروری یا بے مقصد کاموں کے لئے وقت کا بے دریغ استعمال کرتے رہتے ہیں۔بس ضرورت ہے اس کام کی اہمیت وافادیت کو دل میں جاگزیں کرنے اور دوسروں کو اس کی طرف متوجہ کرنے کی۔لاک ڈاؤن کے دوران مساجد ومحلوں میں تذکیری مجلسوں کے موقوف ہونے کی وجہ سے اس ناچیز کو گھر میں ہفتہ وار درسِ قرآن کے توسط سے گھر والوں کے سامنے کچھ کہنے کا موقع ملا تو ان مجالس کے تجربات سے گھر میں دینی مجالس کے انعقاد کی ضرورت وافادیت پر شرح صدر نصیب ہوگیا (اس کے فوائد کی تفصیلات ایک علٰیحدہ مضمون کی طالب ہیں)۔ بلا شبہ قرآن کی ہر بات برحق ہے،اللہ رب العزت کا کوئی حکم حکمت ومنافعیت سے خالی نہیں، وہ بہرصورت موجبِ خیر وبرکت ہوتا ہے۔قرآن کریم کا نہایت واضح اعلان ہے:وذکّر فاِنّ الذکرٰی تنفع المؤمنین (الذاریٰت: ۵۱/۵۵) [اور (ایک دوسرے کو اچھی باتوں کی) یاددہانی کراتے رہو، بے شک یاد دہانی کرنا اہلِ ایمان کو نفع پہنچاتا ہے]۔اللہ کرے ہم سب کو اِن قرآنی نکات کو سمجھنے، دوسروں کو سمجھانے اور ان پر عمل کی توفیق نصیب ہو۔آمین ثمّ آمین۔

☆☆☆

❑ سوانحی مطالعہ (قسط: ۱)

آپ بیتی شیخ تقی الدین ہلالی مراکشیؒ

ترجمہ وتلخیص: مولانا طلحہ نعمت ندوی

[علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی کا نام ہندوستان کے عربی حلقوں کے لیے نیا نہیں ہے۔انھوں نے یہاں کی ایک نسل تیار کی ہے،مولانا سید الحسن علی ندوی،مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا محمد ناظم ندوی جیسے متعدد اساطین عربی زبان وادب سے اس سرزمین ہند کو سرفراز کیا ہے۔اس سرزمین پر عربی زبان وادب کے فروغ میں ان کی کوششو ں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔اردو میں ان کی آپ بیتی کی تلخیص جو شیخ محمد المجذوب کی 'علماء ومفکرون' سے ماخوذ ہے،پیش خدمت ہے۔]

میرے والد نے خواب دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے،تمہارے گھر ایک بچہ ہوگا اس کا نام محمد تقی رکھنا،چنانچہ ایسا ہی ہوا؛لیکن ہندوستان میں مجھے تقی الدین کے نام سے پکارا گیا،اس کے بعد محمد تقی الدین میرا نام مشہور ہوگیا،میری کنیت ابوشکیب ہے،اس لئے کہ میں نے اپنے سب سے پہلے بچہ کا نام اپنے دوست شکیب ارسلان کے نام پر شکیب رکھا،اس کے علاوہ میرا کوئی لقب نہیں ہے،میرے والد کا نام عبدالقادر ہلالی ہے،ہلالی نسبت ہلال کی طرف ہے جو میری گیارہوں پشت میں میرے دادا تھے۔میرا سلسلۂ نسب حضرت حسینؓ سے جاکر مل جاتا ہے،مراکش کے اہل بیت کی تاریخ لکھنے والے متعدد مصنفین نے اس کی وضاحت کی ہے،اور سلطان حسن اول جب سنہ ۱۳۱۱ھ میں ہمارے شہر سلجماسہ آئے تھے تو اس کی تائید کی تھی۔

میری پیدائش ۱۳۱۱ھ کے اواخر یا ۱۲ھ کے اوائل میں غیضہ نامی گاؤں میں ہوئی،اس کو الفرخ بھی کہا جاتا ہے،یہ شہر سلجماسہ کے یفلی علاقہ کے دیہاتوں میں شمار ہوتا ہے،میری والد اور میرے دادا نے مجھ کو بتایا تھا کہ میرے جد اعلیٰ عبدالقادر بن ہلال قیروان سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے جو مملکت تیونس کا ایک علاقہ ہے،اس روایت کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ہمارا گاؤں بہت چھوٹا ہے،اسی کے ایک حصہ میں ہمارے دادا کی قبر ہے اور اس کی چہار دیواری بھی ہے،ان کا شمار اہل اللہ اور صلحاء میں تھا،میرے گاؤں کا نام انھی کی نسبت سے اولاد عبدالقادر ہے،اس میں ایک مسجد ہے جس کے اوقاف کی تعداد اس سے دوسو میٹر کے فاصلہ پر آباد ایک دوسرے بڑے گاؤں کے اوقاف کے بالکل برابر ہے،میرے جد اعلیٰ مراکش سے یہاں نویں صدی ہجری کے اواخر میں تشریف لائے تھے،ایسا لگتا ہے کہ اس دیار کے (جو غرفہ کہلاتا ہے) لوگوں نے ان کی آمد پر یہاں ان کا پرتپاک استقبال کیا اور پورے احترام وتعظیم سے پیش آئے،شاید ان کا شمار علماء میں تھا،لیکن ان کا کوئی علمی ورثہ ہمارے پاس محفوظ نہیں جس سے

اس خیال کی تصدیق ہو سکے،لیکن میرے بچپن تک میری بستی کے تمام لوگ چند لوگوں کے علاوہ تعلیم یافتہ تھے، جب کہ آس پاس کی دیگر بستیوں میں اس کے برعکس پڑھے لکھے بہت کم تھے۔اسی طرح غرفہ کے علاقہ میں قبائل کی بھی کثرت تھی، جب کہ اولاد عبدالقادر میں بہت کم گھر کی آبادی تھی اور مذکورہ قبائل میں کسی قبیلہ سے ان کا تعلق بھی نہیں تھا۔ ہمارے جداعلیٰ کا احترام وہاں باشندوں کے اندر جس قدر تھا اس کا اندازہ ان اوقاف کی کثیر تعداد سے ہوتا ہے جو انہوں نے ان کی چھوٹی سی مسجد کے لیے وقف کر دیا تھا۔ میں اپنے گاؤں میں نہیں پیدا ہوا کیوں کہ میرے والد فرخ کی بستی میں امام ومفتی تھے،اور وہاں کے نائب قاضی بھی تھے۔میرے گھر والے اس علاقہ کی اصطلاح کے مطابق اہل علم تھے گرچہ میں کسی مقلد کو عالم نہیں تسلیم کرتا۔

میری تعلیم

میں نے قرآن پاک اپنے والد اور دادا سے پڑھا اور بارہ سال کی عمر میں مکمل حفظ کر لیا،میرے والد کا ارادہ تھا کہ اس کے بعد مجھے اس دور کے معروف قاری شیخ احمد بن صالح کی خدمت میں بھیجیں ،اور میں ان کو پورا قرآن پاک تجوید کے ساتھ سنا کر اصلاح لوں،لیکن اچانک میرے والد کی وفات ہوگئی ،لیکن میری والدہ نے اسی فیصلہ پر عمل کیا اور میں نے تجوید کے ساتھ موصوف کو ایک ختم سنایا، میں اپنی یادداشت سے روزانہ ربع پارہ تختی پر لکھتا پھر ان کی خدمت میں پیش کر دیتا کہ وہ مصحف عثمانی کی رسم کے مطابق اسے درست کر دیں ،پھر وہ اس کو پڑھتے اور میں سنتا،اس کے بعد میں پڑھتا اور وہ سنتے ،اگر میں کہیں غلطی کرتا تو ٹوکتے اور اصلاح کر دیتے،اس کے بعد میرا ایک عرصہ بغیر کسی تعلیمی مشغلہ کے گذرا،اسی اثناء میں میں تلاش معاش میں ۱۳۳۳ھ میں الجزائر چلا گیا ،وہیں میں نے حضور پاک علیہ السلام کو خواب میں دیکھا ، مجھے ایسا لگا جیسے میں عالم بیداری میں آپ کی زیارت کر رہا ہوں،اس وقت میں تیجانی سلسلہ تصوف سے وابستہ ہو چکا تھا لیکن اس وقت تک علم دین کی تحصیل کا مجھے بالکل خیال نہیں آیا تھا، بلکہ صوفیہ کے اصول کے مطابق کثرت عبادت کا اہتمام کرتا اور اس راہ کی جدوجہد کے ذریعہ علم باطن کے حصول میں کوشاں تھا۔ جب آپ ﷺ کی زیارت ہوئی ،تو آپ مجھے دراز قد اور سفید ریش نظر آئے ، جو دیکھنے والے کا نقص سمجھا جاتا ہے، میں نے اپنا ہاتھ آپ ﷺ کے ہاتھ میں رکھ دیا اور خیال آتا ہے کہ چوما بھی،اور عرض کیا ، میرے آقا!اللہ کے رسول! مجھے میرا ہاتھ پکڑ کر اللہ تک پہنچا دیجئے،آپ نے مجھ سے ارشاد فرمایا،اور یہ فرماتے ہوئے چہرۂ مبارک پر کچھ انقباض کے آثار تھے،کہ تعلیم حاصل کرو ، میں نے عرض کیا،کیا علم ظاہر یا علم باطن،آپ نے ارشاد فرمایا،علم ظاہر، میں نے پھر عرض کیا ،کیا مسلمانوں کے ملک میں یا نصاریٰ کے ملک میں؟اس وقت یہ حال تھا کہ ہمارے ملک کے علماء الجزائر کا سفر کرنے والے ہر شخص کی تکفیر کرتے تھے، اس لئے کہ وہاں فرانس کی حکومت تھی ،آپ ﷺ نے جواب میں مجھ سے ارشاد فرمایا کہ تمام ممالک اللہ ہی کے ہیں ،اس پر میں نے عرض کیا ،یارسول اللہ! آپ دعا فرمادیں کہ میرا خاتمہ ایمان پر ہو،آپ ﷺ اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھائی اور مجھے سے ارشاد فرمایا،عنداللہ یعنی یہ دعا اللہ کے یہاں محفوظ ہوگئی۔

اس خواب سے بیدار ہوا تو میں فوراً شیخ محمد سیدی بن حبیب اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا،اور پورا خواب سنایا،اور ان سے مشورہ کیا کہ حصول علم کے لئے کہاں جاؤں؟،مراکش،تیونس،الجزائر کے بڑے تعلیمی اداروں میں سے کس کا قصد کروں،شیخ کا خود ایک اپنا مدرسہ تھا جہاں مبادیات کی تعلیم ہوتی تھی،اور طلبہ کے خورونوش کا بھی انتظام انھی کی طرف

سے تھا، جیسا شنقیط کے علماء کے یہاں کا معمول ہے، وہ تواضع کے ساتھ کرم وفیاضی اور حلم وبردباری کے اوصاف سے آراستہ تھے، کمال تواضع وشفقت کے ساتھ مجھ سے کہنے لگے: ہمارے ہی مدرسہ میں رہ جاؤ اور جو ابتدائی تعلیم یہاں ہوتی ہے وہ مکمل کرلو، اس کے بعد کسی مدرسہ میں داخلہ لے لینا۔

یہ میری حماقت ونادانی اور بے ادبی تھی کہ ان کے مدرسہ کی تعلیم کو قابل اعتنا نہ سمجھ کر انھی سے کسی دوسرے بڑے مدرسہ میں داخلہ کے لئے مشورہ کرنے لگا، ان کے حسب مشورہ میں دیہات میں ان کے پاس ہی رک گیا، ان کا مدرسہ ایک خیمہ نما جھونپڑا تھا، جو ان کے رہائشی جھونپڑے کے، جہاں وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ مقیم تھے، بالکل قریب ہی تھا۔ اسی مدرسہ اور عمارت میں میں نے دو سال گذار دئے، اس کے بعد انہوں نے اپنا مدرسہ اپنے شہر المشر بہ میں منتقل کرلیا، وہاں میں نے ان کی خدمت میں پانچ سال گذارے، زہد وتقویٰ اور مکارم اخلاق میں ہندوستان کے ایک بزرگ کو چھوڑ کر جن کا میں آگے ذکر کروں گا، ان کے جیسا مجھے کوئی اور نہیں نظر آیا، ان کے مناقب وکمالات اتنے ہیں کہ یہاں ان کی تفصیلات نہیں لکھی جاسکتیں، ان کا تعلق شہر شنقیط کے ایک معروف قبیلۂ تندغ سے تھا، ان کا انتقال تقریبا ۱۳۳۸ھ میں ان کے شہر المشر بہ میں ہوا، جو الجزائر کے صوبہ وہران میں پڑتا ہے۔

وہاں سے میں نے مراکش کا رخ کیا، اور سنہ ۱۳۴۰ھ میں شہر فاس پہنچ کر کچھ علماء کے حلقۂ درس میں شریک ہوا، وہاں قروبین کے علماء نے میرا بہت اکرام واعزاز کیا اور میرے ساتھ ایک استاد کا سا سلوک کیا، ان میں خاص طور پر فاطمی شراوی شیخ اور میرے ایک دو استاد قابل ذکر ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو طریقۂ تیجانیہ اور شرک وقبر پرستی سے نجات دی، یہ شخصیت محقق وعالم جلیل فاضل دوراں محمد بن العربی العلوی کی تھی، میرے اور ان کے درمیان ایک مناظرہ بھی ہوا جس کا میں نے تفصیل سے اپنی کتاب ''فکاک الاسیر العانی المکبول بالکبل التیجانی'' میں ذکر کیا ہے، دوسرے معروف عالم وادیب اور شاعر احمد سکیرتج تھے۔ شیخ علوی کی وفات تقریباً ۱۳۸۷ھ میں ہوئی، اور شیخ احمد سکیرتج اس کے کچھ عرصہ پہلے س دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کے علاوہ بھی کئی اساتذہ وشیوخ تھے، جن کا تذکرہ میں نے یہاں قصداً نہیں کیا کیوں کہ ان کا عقیدہ درست نہیں تھا۔ عقیدہ کے اعتبار سے مراکشی اساتذہ میں بس انھی دونوں مذکورہ علماء شیخ شراوی اور استاد علوی سے مطمئن تھا۔ میں نے جامع القروبین سے ایک ڈگری حاصل کی جس کو بون یونیورسٹی نے وہاں کے اساتذہ کی تصدیق کی بنیاد پر ہائی اسکول کی ڈگری کے مماثل قرار دیا، اور اسی کی بنیاد پر میں بعد میں بون یونیورسٹی کا طالب علم بن سکا۔

۱۳۴۰ھ کے اخیر میں میں نے قاہرہ کا سفر کیا، اور ایک سال مصر میں گذارا، اس دوران وہاں کے معروف سلفی عالم ومصلح امام شیخ رشید رضا رحمۃ اللہ علیہ کی صحبتوں سے سرفراز ہوتا رہا، ان کے علاوہ سلفی علماء کی ایک پوری جماعت سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، جن میں شیخ محمد الرمالی، شیخ حسن عبدالرحمٰن، شیخ عدوی، شیخ عبدالعزیز الخولی، شیخ عبدالظاہر ابوالسمح، اور شیخ محمد عبدالرزاق، اور شیخ محمد ابوزید وغیرہ تھے۔

اسی اثناء میں جامع ازہر کے درجات عالیہ کے محاضرات میں بھی حاضر ہوتا رہا، ازہر کے ایک بڑے استاد شیخ زنکلونی نے مجھ سے فرمایا کہ مصر میں علم حدیث کی تحصیل مت کرنا، یہاں ہماری جماعت علماء کا یہ حال ہے کہ ہم کو نہ دس حدیثیں یاد ہیں، نہ صحیح وضعیف حدیث کا فرق سمجھ میں آتا ہے، بس مصنفین کے مقلد بن کر سفید اوراق میں کالے کالے حروف پڑھتے رہتے ہیں، اسی دوران میری نظر سے کتاب عون المعبود شرح ابوداود گذری جو ہندوستان میں لکھی گئی اور وہیں شائع بھی ہوئی تھی، اس کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی

ہندوستان میں علم حدیث کے ماہر علماء موجود ہیں، چنانچہ میں نے ہندوستان کے سفر کا ارادہ کرلیا۔ جس سال میں مصر میں مقیم تھا، اسی سال میں صعید بھی گیا تھا کہ کچھ مالی تعاون حاصل ہوجائے جس سے میں حج کا قصد کرسکوں۔ تیجانی حلقہ نے مجھے الجزائر سے ایک چک بھیجا تھا، وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اب تک میں ان کے عقیدہ پر قائم ہوں، میں نے ان کو ایک لمبا خط لکھا جس میں ان کے موجودہ وگذشتہ احسانات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دلائل سے ان کو بتایا کہ ان کا طریقہ غلط ہے، اور یہ سلسلہ اور نبی پاک علیہ السلام کا لایا ہوا دین ایک ساتھ کسی انسان کے دل میں جگہ نہیں پاسکتے، اس خط کو پڑھ کر وہ لوگ بہت ناراض ہوئے۔ اس وقت ہمارے ایک رفیق نے مجھے مشورہ دیا کہ میں مذکورہ بالا مقصود کی تحصیل کے لیے علاقۂ صعید کا رخ کروں، چنانچہ ان کے مشورہ کے مطابق جب میں ضلع اسیوط کے شہر ملاوی پہنچا، تو ریمون نامی گاؤں میں سلفیوں کے امیر شیخ اسماعیل صیفی نے وہاں مدعو کیا، وہاں سلفیوں کی تعداد بہت کم تھی، اور شہر کے شیخ اور شرفا ومعززین اور تمام گاؤں والے ان کو وہابی کہتے تھے اور ان سے دشمنی رکھتے تھے، اس کے بعد میں شیخ اسماعیل کے گھر میں وعظ کہنے لگا، اسی طرح سلفیوں کی مسجد میں بھی وعظ کی مجلسیں قائم کیں، اس وعظ واصلاح کا نتیجہ یہ ہوا کہ واعظ شہر شیخ یوسف نے میری دعوت قبول کرلی اور میرا مسلک بھی قبول کرلیا، اور پورا شہر ان کی تقلید میں اسی مسلک کا پیرو ہوگیا، اب بدعات کے حامی صرف پیر صاحب اور امیر شہر مرفوت اور ان کے حاشیہ بردار باقی رہ گئے۔

میں نے جب دیکھا کہ سارے لوگ پورے طور پر سنت کے مطابق عمل کرنے لگے ہیں، اور اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہیں تو میں نے جس مقصد سے اس علاقہ کا رخ کیا تھا اس کا ارادہ دل سے نکال دیا، اور پوری طرح استغناء کا اظہار کیا، کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں ان کے سامنے اپنی ضرورتیں ذکر کرنے لگوں تو اس سے دعوت کو سخت نقصان پہنچے گا، یا اس میں کمی آجائے گی، میں ان کے یہاں تین ماہ رہا، پھر حج کا زمانہ آگیا، اور کسی نے مجھے کچھ مالی پیش کش کی جرات نہیں کی، صرف شیخ یوسف نے بہت اصرار کرکے کچھ کپڑے مجھے ہدیہ دے دئے، ان کے اصرار پر میں نے اس کو قبول کرلیا۔

جب میں قاہرہ واپس آگیا تو انہوں نے مجھ ایک چک بھیجا جس میں تیرہ جنیہ (مصری کرنسی) تھے، اس رقم سے میں نے حج کا قصد کیا، وہاں سے فراغت کے بعد میں ہندوستان پہنچا، یہاں علماء اہل حدیث سے ملاقاتیں کیں، ان کے ایک مدرسہ میں پڑھایا بھی، جہاں پندرہ ماہ مقیم رہا، اور اسی کے ساتھ اس دور کے مایہ ناز عالم ومحدث شیخنا عبدالرحمٰن مبارک پوری سے علم حدیث پڑھ کر اس کی اجازت حاصل کی۔ ان کی خدمت میں ایک عرصہ گذارا، صحاح ستہ کے متعدد اجزاء شیخ محمد بن حسین بن محسن حدیدی انصاری یمانی سے پڑھے، جو اس وقت بھوپال میں مقیم تھے، وہاں سے میں بصرہ چلا گیا جہاں سلفی عالم شیخ امین شنقیطی سے ملاقات ہوئی، اور انھی کی صاحبزادی سے شادی بھی ہوگئی، بصرہ میں تین سال رہ کر میں سعود عرب چلا گیا، حجاز جاتے ہوئے مصر سے گذر ہوا تو سید رشید رضا سے ملاقات ہوگئی، میں نے ان سے ذکر کیا کہ میں حجاز جارہا ہوں تو انہوں نے ملک عبدالعزیز کے نام خط دے دیا، اس میں لکھا کہ آفاق عالم سے جو علماء آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے ہیں ان میں محمد تقی الہلالی سب سے افضل وممتاز ہیں، لہذا مجھے امید ہے کہ آپ لوگ ان کے علم سے مستفید ہوں گے، یا اسی طرح کے الفاظ تھے، چنانچہ حجاز میں میں نے شاہ کی مہمانی میں چھ ماہ گذاردئے اس کے بعد مسجد نبوی میں مدرسین کا نگراں مقرر کیا گیا، وہاں میں دوسال رہا، اس کے بعد مسجد حرام اور معہد سعودی مکہ منتقل ہوکر یہاں آگیا، اسی سال اخیر میں شیخ سلیمان ندوی نے ہندوستان سے

اور شیخ احمد سرکتی نے انڈونیشیا سے مجھے خط لکھ کر مدعو کیا، دونوں نے اپنے اپنے مدرسوں میں تدریس کی دعوت دی، میں نے شیخ سلیمان ندوی کی پیش کش کو ترجیح دی، اس میں یہ مقصد بھی شامل تھا کہ شاید ہندوستان سے میں کسی یونیورسٹی کی سند اور ڈگری حاصل کرسکوں، چنانچہ میں وہاں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ادیب اول یا صدر شعبہ عربی زبان وادب ہوگیا، وہاں میں تین سال رہا، ہندوستان میں رہ کر کسی یونیورسٹی کی تعلیم کا موقع تو نہیں مل سکا، البتہ میں نے انگریزی زبان سیکھ لی، اس کے بعد مجھ پر ملیریا کا حملہ ہوگیا، چنانچہ میں بصرہ واپس آ گیا اور یہاں تین سال تک مدرسۃ النجاۃ میں معلم رہا، پھر وہاں سے جنیوا کا سفر کیا، وہاں مشہور مجاہد وولیڈر امیر البیان شکیب ارسلان کے اصرار وطلب پر انھی کے پاس ٹھہرا، وہاں کوشش کی کہ جامعاتی (یونیورسٹی) تعلیم کے لئے برطانیہ جاؤں، لیکن جنیوا کے انگریزی سفیر نے مجھ سے کہا کہ اس سفر کے لئے مالی یا کسی کی شخصی ضمانت ضروری ہے، چنانچہ امیر شکیب ارسلان رحمہ اللہ نے برلین میں جرمنی وزارت خارجہ میں اپنے ایک دوست کو خط لکھا جس میں لکھا کہ میرے پاس ایک مراکشی نوجوان ادیب موجود ہے، شاید ایسا آدمی جرمنی کو نہ ملا ہو، وہ کسی یونیورسٹی میں تدریسی خدمت چاہتا ہے، امید ہے کہ آپ کے ذریعہ ان کو عربی ادب کی تدریس کی کوئی جگہ مل سکے گی اور اتنی تنخواہ ضرور ہوگی کہ اس کے ذریعہ وہ اپنی جامعاتی تعلیم مکمل کرسکے، اس خط کے جواب میں منظوری آ گئی، ایک سال کے اندر اندر میں نے امتحان دیا اور جرمنی زبان میں ڈپلومہ کی سند حاصل کرلی، اس کے بعد لکچرر شپ کے ساتھ میں وہاں یونیورسٹی کا طالب علم بھی ہوگیا، وہاں قیام کے دوران میں نے استاد باول کالی (جو یونیورسٹی میں علوم مشرقیہ کے استاد تھے) کے ساتھ مل کر دو عربی کتابوں کا ترجمہ کیا، ایک کتاب محمد الفقیہ البغدادی متوفی اواخر تیسری صدی ہجری کی ''کتاب البلدان الجغرافیہ العالمیہ'' تھی، اور دوسری محمد بن دانیال الکحال (یعنی آنکھ کے ڈاکٹر) موصلی مقیم مصر کی طیف الخیال تھی، یہ کتاب تین تمثیلات (ڈراموں) پر مشتمل تھی، مجھے عربی ادب میں ان کے علاوہ کوئی اور ڈرامہ نہیں ملتا۔ جرمن مستشرقین نے ایک کتاب مرتب کی تھی جس میں دنیا کی تمام قوموں کے تمثیلی قصوں اور کہانیوں کو یکجا کیا تھا، جب انہیں طیف الخیال ملی، جس کے علاوہ عربوں کا کوئی اور تمثیلی قصہ نہیں ملا تو انہیں بہت مسرت ہوئی اور ایک اس کو ایک گمشدہ کڑی سمجھا، لیکن اس کا ترجمہ ان کے بس کی بات نہیں تھی کیوں کہ اس کے بعض قصے تو فصحیٰ زبان میں تھے؛ لیکن بعض بالکل عامی زبان میں، وہ بھی ساتوں صدی ہجری کی مصری عامی زبان، جس میں نظم ونثر دونوں شامل تھے۔

استاد باول کالی کو معلوم ہوا کہ ایک قبطی طالب علم نے کیمرج یونیورسٹی سے ایک مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے، اس مقالہ کا موضوع ہے، تاریخ الحروب الصلیبیہ، اور اس شخص کا نام سوریال عطیہ ہے، جب ڈاکٹر عطیہ برطانیہ سے واپس آئے تو جامعۃ القاہرۃ کے صدر شعبۂ عربی جو اس وقت ڈاکٹر طہ حسین تھے، کے نام ایک درخواست دی، اس میں گذارش کی کہ اس یونیورسٹی میں تاریخ صلیبی جنگ کے ماہر استاد کی حیثیت سے ان کا تقرر کرلیا جائے، طہ حسین نے اس سے کہا کہ ہماری یونیورسٹی کو تمہاری ضرورت نہیں، وہ کہنے لگا، استاد! کیا دنیا میں کوئی ایسی یونیورسٹی بھی ہے جو صلیبی جنگوں کی تاریخ سے مستغنی ہوسکتی ہے، انہوں نے کہا، ہاں، اس نے پوچھا، بتایئے کون سی یونیورسٹی ہے، ؟ کہنے لگے جامعۃ القاہرہ، اس کے بعد ڈاکٹر یونہی بے کار رہا، اسلام اور مسلمانوں سے اسے شدید نفرت وعداوت تھی، خاص طور پر عرب سے، باول کالی کو خیال ہوا کہ عطیہ کے ذریعہ اس کا مقصود ان کو حاصل ہوجائے، اس نے اس کو خط لکھ کر بلوایا اور بون یونیورسٹی

کے معہد العلوم الشرقیہ (مشرقی علوم کالج) میں استاد تاریخ کی حیثیت سے تدریسی خدمت کی دعوت دی، گرچہ اس معہد کو اس کی ضرورت نہیں تھی، لیکن ان کا خیال تھا ان سے طیف الخیال کے ترجمہ میں مدد مل جائے گی، دو ماہ ان کے ساتھ مل کر اس میں لگے رہے؛ لیکن کتاب کے پہلے ڈرامہ کا ایک صفحہ بھی ترجمہ نہیں کر سکے، اس کے بعد کالی نے مجھ کو بلایا، اور کہنے لگے مجھ کو آپ کی عربی ادب پر قدرت ودسترس میں تو کوئی شک نہیں لیکن اس کا اندازہ نہیں کہ ساتویں صدی ہجری کی عامی مصری زبان بھی آپ جانتے ہیں، اس پر مجھے یقین نہیں، میں نے اسی مقصد سے عطیہ کو بلایا تھا کہ وہ مصری بھی ہے، اور اس کا اختصاص تاریخ میں ہے، میرا خیال تھا کہ اس سے طیف الخیال کے ترجمہ میں مدد ملے گی، دو ماہ تک اس کے ساتھ اس کام میں لگا رہا لیکن پہلا صفحہ بھی ترجمہ نہیں ہو سکا، تم گرچہ قدیم عامی مصری زبان سے دور اور ناواقف ہو؛ لیکن پھر بھی میرا خیال ہے کہ ہم لوگ مل کر اس کا ترجمہ کر سکتے ہیں۔

ہم نے طیف الخیال کا ترجمہ شروع کیا تو پہلے ہی دن میں نے متعدد صفحات کے ترجمے کر دئے، اور ان خطی نسخوں کو بھی پڑھ لیا جن کو وہ نہیں پڑھ سکے تھے، اس کو دیکھ کر استاد کالی خوشی سے پھولے نہ سمائے، سات مہینے میں ہم نے ساری تمثیلات کا ترجمہ بھی کر لیا اور تینوں نسخوں سے مقابلہ کر کے ترجمہ پر نظر ثانی بھی کر لی، اس کے بعد ان کو اس ترجمہ کی صحت میں کوئی شک باقی نہیں رہا، اور انہوں نے اس ترجمہ کے مقدمہ میں میری بہت تعریف کی، اور کہنے لگے اگر محمد تقی الدین نہ ہونے تو یہ کتاب فراموش ہو چکی ہوتی، اسی طرح جتنے محاضرات انہوں نے یورپ کے بڑے شہروں میں دئے ان سب میں میری تعریف کی، تاکہ طیف الخیال کا تعارف ہو اور اس کے ترجمہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

میں تین سال بون میں رہا، پھر وزارت تعلیم کے شعبہ وزارت دعایہ (تشہیر) اور یونیورسٹی کے شعبہ نظامت نے برلین یونیورسٹی کو میری خدمت مستعار دینے کا مطالبہ کیا، تاکہ وہاں جا کر میں عربی نشریات کی نگرانی کر سکوں، جس کو وزارت دعایہ نے برلین میں ۱۹۳۹ء میں قائم کیا تھا، چنانچہ میں اپنے تمام کاموں کے ساتھ اور لکچرار اور طالب علم دونوں حیثیتوں کے ساتھ برلین یونیورسٹی منتقل ہو گیا، اور اس میں ایک عہدہ کا اضافہ کیا، جو برلین میں عربی نشریات کے مرجع لغوی (زبان کی سند) کا درجہ تھا۔

۱۹۴۰ء کی گرمی کے مہینوں میں نے اپنی پی ایچ ڈی کا مقالہ جمع کر دیا، اور امتحان کے لیے پیش کر دیا جو ''الجماہر للجواہر'' کتاب کے مقدمہ کے ترجمہ اور اس پر تعلیقات وحواشی کا کام تھا، مقالہ کے ممتحنین کی تعداد دس تھی، اس مقالہ میں میں نے اس دور کے جرمنی کے سب سے بڑے مستشرق کارل بروکلمان کی اراء کی تردید کی اور اسے غلط قرار دیا، اسی طرح اس دور سے قبل کے ایک مشہور جرمن مستشرق مارتن ہارتھمن کی بھی غلطیاں واضح کیں، ہارتھمن نے البیرونی کی تاریخ الہند کے ترجمہ کے مقدمہ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ البیرونی حقیقت میں زندیق وملحد تھا، اس لئے کہ اس کی عقل اتنی تیز تھی کہ وہ اسلام کو قبول ہی نہیں کر سکتا تھا، وہ شعوبی بھی تھا اور اس کے اندر ایرانیوں کے تئیں تعصب پایا جاتا تھا جنہوں نے آل ساسان کی حکومت کا خاتمہ کیا تھا، اور عربوں سے اس کو شدید نفرت تھی، ان کے علوم کو حقیر سمجھتا تھا، بروکلمان نے اپنی تاریخ میں یہ بھی لکھا کہ علوم عرب کی تحقیر میں وہ حق بجانب تھا۔ ظاہر میں وہ سلطان محمود غزنوی سے ملاقات سے پہلے تک شیعہ تھا، اور سلطان کے دربار میں حاضری اور اس سے ملاقات کے بعد سنی ہو گیا، میں نے اپنے مقالہ کے حواشی میں خود البیرونی کی کتابوں سے ان دونوں کے دعووں کے خلاف دلائل پیش کئے، ان دس ممتحنین کی پوری جماعت نے میری تحقیق سے

اتفاق رائے کیا، اسی وجہ سے ناشرین اپنے مصارف سے میرا مقالہ شائع کرنے میں دلچسپی کا اظہار کرنے لگے، ایسی صورت بہت اہم چند مقالوں ہی کے ساتھ پیش آتی ہے، اور کچھ ہی کو یہ اعزاز حاصل ہوتا ہے، مقالہ کے ٹسٹ میں کامیابی کے دو ماہ بعد میرا شفوی امتحان (وایوا) بھی ہوا، اس میں بھی میں کامیاب ہوگیا، اس جواب کے تمام پہلوؤں کو سمیٹنے کے باوجود میں نے اس میں اختصار سے کام لیا، تفصیلات ترک کردیں۔ بغداد یونیورسٹی میں پہلے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے میرا تقرر ہوا پھر پروفیسر ہوگیا، جب ۱۹۵۴ء میں بون یونیورسٹی نے ایک سال کے لئے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے مجھے بلایا تو اس نے بھی اسے تسلیم کیا، اس سلسلہ کے تمام کاغذات جامعہ اسلامیہ مدینہ میں موجود ہیں۔

قضا کی ملازمت مجھے پسند نہیں، اسی لئے جب ۱۳۴۰ھ میں جب شیخ احمد سکیرج نے مجھے قضا کے منصب پر فائز کرنا چاہا تو میں نے انکار کردیا کیونکہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ خود شیخ احمد سکیرج جو علاقہ وجدہ کے قاضی القضاۃ تھے، اہم مقدمات میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے فرانسیسی وائسرائے سے مشورہ کرتے اور کبھی کبھی ان کی چاپلوسی بھی کرنی پڑتی اور ان دونوں میں کبھی کبھی تکرار بھی ہو جاتی، جب کہ قضا خالص شرعی کام تھا، اس کے علاوہ اور بھی اسباب تھے، مثلاً سامراجیت سے نفرت اور اس سے جنگ کا ارادہ اور نیت۔ اب یہاں میں دوسرے بعض واقعات کا ذکر کرتا ہوں۔

(۱) میں بون یونیورسٹی (جرمنی) میں پی ایچ ڈی کا طالب علم بھی تھا اور لکچرر بھی، اس دوران وہاں کے استاد کاباول کالی کچھ متہم قرادئے گئے، ان کی اہلیہ کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ ان کا میلان یہودیت کی طرف ہے، وہ اس الزام سے اپنی براءت کا اظہار نہیں کر سکے، تو انہیں یونیورسٹی سے معزول کردیا گیا، وہ میری تنخواہ کا ایک حصہ ایسی جگہ سے لے کر میرے حوالہ کرتے تھے جس کا مجھے علم نہیں تھا، جب اس الزام کی بنا پر وہ وہاں سے فرار ہوکر اٹلی چلے گئے تو وہ حصہ ملنا بند ہوگیا، اور تنخواہ کا جتنا حصہ میں یونیورسٹی سے براہ راست خود لیتا تھا وہ میرے لئے ناکافی تھا اس کے نتیجے میں سخت پریشانی میں مبتلا ہوگیا، لیکن اللہ نے مصیبت دور فرمادی، چنانچہ وزارۃ الدعایہ نے مجھے بلایا جیسا کہ گذر چکا، اس کے بعد مجھے اچھی تنخواہ ملنے لگی، جو ۱۴۰۰ روپیے تھی۔

(۲) دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ حضرت مفتی سید امین حسینی صاحبؒ نے دوسری عالمی جنگ کے دوران ایک سیاسی مہم پر مجھے مراکش بھیجا، اس وقت انگریزوں نے عراقی سفیر برائے روم (اٹلی) یا امبیسی (دارالسفارت) کے کسی ملازم کو یہ حکم جاری کردیا تھا کہ میرے پاسپورٹ کی تجدید نہ کرے اور مجھے بتادے کہ سفارت عراق مجھے عراقی تسلیم نہیں کرتی، اس وقت مزاحم باجی سفیر تھے، اب مجھے نہیں معلوم کہ ان کو خود اس کی خبر ملی یا وہ انگریزوں سے ڈر گئے یا انگریزوں نے خود اپنی عیاری اور معرف چالاکی کی بنا پر یہ رائے قائم کی کہ عراقی سفارت خانہ میں متعین اپنے ماتحت ملازم کے توسط سے اپنا تحفظ کرلیں۔ اس کے بعد مراکشی سفیر عبدالخالق طریسی مرحوم نے مجھے اہل تطوان کے باشندہ کی حیثیت سے میرے پاس پاسپورٹ بھجوایا، اس پاسپورٹ کو لے کر میں نے مراکش کا سفر کیا، وہاں اسپین والوں نے سمجھا کہ ہٹلر کی حکومت نے مجھے اپنی حمایت کرنے والوں کے شہر میں بھیجا ہے تاکہ ان کو وہاں سے بھگادے اور ان کی حمایت کی جگہ جرمنی کی حمایت انہیں حاصل ہو، اور انہوں نے میرے سامنے اپنے اس خیال کی وضاحت بھی کی اور پاسپورٹ کو جھوٹا اور غلط بتا کر میرے ہاتھ سے لے لیا اور کہنے لگے کہ میں تطوان کا باشندہ نہیں ہوں بلکہ شاہی علاقہ سے تعلق رکھتا ہوں جس کو فرانس کی حمایت حاصل ہے، بہت بڑی طویل بحث ومباحثہ کے بعد کہنے لگے کہ اگر

آپ اس الزام سے بری ہیں تو الاصلاح الوطنی پارٹی کے ترجمان ''الحریہ'' میگزین میں ایک مضمون لکھ کر بالصراحت لکھوں کہ مراکش کی سامراجیت کا کوئی حق جرمنی کو نہیں، نہ اس کے کسی حصہ کو اپنی حمایت میں لینے کا حق حاصل ہے۔ میں نے وہاں کے لیڈر اور مذکورہ پارٹی کے صدر عبد الخالق سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کوئی حرج نہیں، تو میں نے ایک طویل مقالہ قلمبند کیا جس میں صراحت سے لکھا کہ مراکش پر صرف وہاں کے باشندوں یعنی مراکشیوں کا حق ہے، نہ اس پر کسی طرح جرمنی کا حق ہے نہ فرانس کا نہ اسپین کا نہ دوسری حکومتوں کا ، اس مقالہ سے وہ لوگ خوش ہو گئے اور انہیں اطمینان ہو گیا ، اس کے بعد انہوں نے مجھے اقامہ دیا لیکن صرف شہروں کا، اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگائی کہ کسی بھی سیاسی معاملہ میں اہل وطن کا ساتھ نہ دوں ، نہ کوئی تحریر لکھی جائے نہ کوئی درس ہو اور نہ کوئی تقریر ان کی اجازت کے بغیر ہو، ورنہ وہ لوگ مجھے فرانسیسیوں کے حوالہ کر دیں گے ۔ میں نے ان کی اس شرط کا پورا التزام کیا، ان کے زیر اقتدار علاقوں میں تقریباً پانچ سال رہنے کا اتفاق ہوا، اس دوران میرے پاس اخوان المسلمین کے شیخ حسن البنا شہید رحمۃ اللہ علیہ کا خط پہنچا، اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ عالم اسلام کے ہر علاقہ اور ہر ملک میں ہمارے نامہ نگار ہیں مگر مراکش میں کوئی نہیں ، آپ سے گذارش ہے کہ معلوم کریں کوئی نامہ نگار مل جائے تو اس سے کام اور اس کا معاوضہ جو اسے اس کام پر مطلوب ہو معلوم کر کے بتائیں تا کہ اخوان المسلمین کے اخبار میں وہاں کی خبریں شائع ہو سکیں، اور اگر خود آپ یہ کام لے لیں تو بہتر ہوگا، میں نے ان کی یہ درخواست قبول کر لی اور خفیہ اخوان المسلمین کے اخبار کو تطوان کی انگریزی ڈاک کے ذریعہ مراسلات بھیجنے لگا، لیکن اسپینیوں نے انگریزی محکمۂ ڈاک کے ایک مراکشی ملازم سے رابطہ رکھا تھا کہ اگر کوئی بھی ایسا خط ملے جس میں اسپین والوں کا اچھا یا برا ذکر ہو تو وہ اس کی ایک نقل محفوظ کر لے، ان کی طرف سے اسے ہر خط کے نقل کرنے اور محفوظ رکھنے کا گراں قدر معاوضہ دیا جائے گا، اس نے انہیں تمام مراسلات اور مقالات سے باخبر کر دیا جو میں نے اب تک اخوان المسلمون کو بھیجے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے مجھے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا، لیکن مجھ پر کوئی الزام عائد نہیں کیا، جیل میں میں نے تین ہی دن گذارے تھے کہ میں جس شہر میں مقیم تھا جس کا نام شفشان تھا وہاں کے باشندوں نے ہسپانوی سفیر برائے شہر طنجہ (مراکش) کے سامنے صدائے احتجاج بلند کی اور لندن ریڈیو اسٹیشن نے مراکشی لہجہ میں اس گفتگو اور احتجاج کو نشر کیا، اس کے بعد انہوں نے مجھے رہا کر دیا۔ اس کے بعد جب میں ان سے ان کی کرنسی بدل کر مصری کرنسی (جنیہ) لینا چاہا تو انہوں نے انکار کر دیا اور اشارہ کیا کہ آپ نے ہمارے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے۔ شہر کا مجسٹریٹ (المراقب المدنی) کہنے لگا ہم پہلے غافل تھے اب نہیں ہیں، لیکن میرے مشفق و کرم فرما شاہی خلیفہ حسن بن مہدی (بارک اللہ فی حیاتہ) نے انہیں مجبور کیا کہ میری کرنسی ایکسچینج کرے۔

اس کے بعد میں نے عراق کا سفر کیا وہاں رہ کر جب ایک کتاب کانگریزی سے عربی میں ترجمہ کیا تو اشاعت کے بعد ان لوگوں کو برا لگا اس کے علاوہ بغداد اخبار السجل میں مقالات و مضامین کے ذریعہ ان کے بہت سے جرائم سے لوگوں کو مطلع کیا اور اس طرح جس کا انہیں خطرہ تھا، وہ پیش آ ہی گیا۔ میں انھی چند واقعات پر اکتفا کرتا ہوں۔ اگر فرصت ہوئی تو مفصل سارے واقعات لکھوں گا ، بہت سارے حضرات کا اصرار ہے۔

(جاری.....)

☆☆☆

❑ مطالعۂ تاریخ

ہند میں اسلام کی آمد

محمد عرفان
ریسرچ اسکالر شعبۂ دینیات سنی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

تجارتی ساز وسامان کے تبادلہ کے ذریعہ ہندوستان اورعرب کے درمیان تعلقات قائم تھے، اسلام سے پہلے بھی عربوں کی نظر میں ہندوستان اپنی خوبصورتی اور مصنوعات کی وجہ سے مشہور تھا، عرب کے لوگ خوبصورت عورتوں کا نام ہند رکھا کرتے تھے، اور ہندوستان سے ''ایلہ '' اور ''عدن'' وغیرہ جیسے عربی تجارت گاہوں میں عود ہندی (ایک درخت اوراس کی سیاہ لکڑی جو آگ میں جل کر نہایت عمدہ خوشبو دیتی ہے) مشک، کافور (کپور)، قرنفل (لونگ)، زنجبیل، ساگوان کی لکڑی، دواؤں میں قسط ہندی، ناریل اور ہاتھی کے دانت وغیرہ جیسی چیزیں پہنچتی تھیں اور وہاں سے ہندوستانی ساحلی شہر، جیسے ''کراچی'' ، ''کرنکنور'' اور ''کورمنڈل'' میں کپڑے، قیمتی پتھر، کھجور اور سونے وغیرہ جیسی قیمتی چیزیں آتی تھیں(۱)۔

ہندوستان کا مغربی ساحلی علاقہ جو ملیالم یا مالابار سے مشہور ہے عرب تاجروں کی تجارتی کشتیوں کی محفوظ اور مستقل بندرگاہ تھا، اور جب مکہ عظیم تجارتی مرکز میں تبدیل ہوگیا، اور قریش کے قافلے سردی میں یمن اور گرمی میں شام کی طرف کوچ کرنے لگے تو ہندوستانی مصنوعات اور یہاں کی بنائی ہوئی چیزیں قریشی تجارت میں بھی شامل ہوگئیں، عہد نبوی میں ہندوستانی جڑی بوٹیاں عرب کے بازاروں میں اپنی جگہ بنا چکی تھیں، ہندوستان میں بنی ہوئی تلواریں ان کے نزدیک پسندیدہ ہتھیار تھیں، اسی وجہ سے انہوں نے اپنے اشعار میں اس کا بکثرت ذکر کیا ہے۔

ایک حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ اہل ہند کے حلیہ اور خدوخال سے واقف تھے، ممکن ہے کہ بعثت سے پہلے تجارتی سفر کے دوران آپ ﷺ کی ملاقات ان سے ہوئی ہو، ابن سعد کی روایت ہے کہ خالد بن ولیدؓ کے ساتھ قبیلہ بنو حارث کا وفد حاضر ہوا تو رسول اللہ نے حضرت خالدؓ سے دریافت کیا: ''**من هؤلاء الذين كانهم رجال الهند؟**'' یہ کون لوگ ہیں جو ہندوستان کے معلوم ہوتے ہیں؟ خالد بن ولید نے جواب دیا: ''یہ بنو حارث بن کعب کے لوگ ہیں'' (۲)

چنانچہ نبی کریم ﷺ نے حضرت موسیٰؑ کے قد وقامت اور لمبائی کو ایک ہندوستانی قوم جاٹ سے تشبیہ دی ہے، جیسے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**رأيت عيسى وموسى وابراهيم ،فأما عيسى فأحمر جعدعريض الصدر، وأماموسى فآدم جسيم سبط كأنه من رجال الزُّط**'' (۳) (میں نے عیسی، موسی اور ابراہیم علی نبینا وعلیہم السلام کو دیکھا، بہرحال عیسیٰؑ سرخ گھنگھریالے بال والے اور کشادہ سینے والے ہیں اور جہاں تک موسیٰؑ کا تعلق ہے تو وہ گندم گو، بھاری بھرکم سیدھے غیر گھنگھریالے بال والے، گویا وہ جاٹ

کے افراد میں سے کوئی ہوں)۔

نبی کریم ﷺ نے اس جماعت کو خوشخبری سنائی جو غزوہ ہند میں شریک ہو، جیسا کہ حضرت ثوبانؓ جو آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام ہیں سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''عصابتان من امتی احرزهم الله من النار : عصابة تغزو الهند، وعصابة تكون مع عيسى بن مريم '' (۴) (میری امت کے دو گروہ کو اللہ تعالی نے جہنم سے محفوظ کر دیا ہے، ایک وہ گروہ جو ہندوستان کے جہاد میں شریک ہو، اور دوسرا جو عیسی بن مریم کے ساتھ میں ہوگا)۔

اور ہندوستانی باشندگان بھی عرب باشندگان کو جانتے تھے، چنانچہ سرزمین حجاز پر جب اسلام کا سورج چمکا اور اس کی کرنوں سے اس کے ذرات منور ہوئے، تو یہ دعوت اہل ہند پر بھی مخفی نہیں تھی، چنانچہ اسی دعوت کی تاثیر سے رتن ہندی، ابورضارتن بن نصر بن کرپال نے مکہ کا سفر کیا اور مشرف باسلام ہوکر اپنے وطن لوٹے، (۵)۔

اور جب شاہ چیرامان پرمال(Cheraman Perumal) نے شق قمر کا معجزہ دیکھا، تو تحقیق حال کیلئے مختلف سمتوں میں قاصد بھیجے، چنانچہ تحقیق حال کے بعد اسے بتایا گیا کہ ایک ہاشمی شخص مکہ میں ظاہر ہوئے ہیں اور ان کا دعوی ہے کہ وہ سارے جہان کی طرف اللہ کے رسول ہیں، اور اہل مکہ نے دیگر انبیاء کے معجزات کی طرح ان سے ایک معجزہ کا مطالبہ کیا اور ان کے پاس یہ تجویز رکھی کہ وہ چاند کو حکم دیں کہ وہ آسمان میں چاک ہوجائے اور پھر اپنی حالت پر لوٹ آئے، تو اللہ تعالی کی قدرت سے انہوں نے ایسا کیا، سو یہی شق قمر کا واقعہ ہے۔

چنانچہ اس بادشاہ کو اس باکمال نبی کی زیارت کا شرف حاصل کرنے کا شوق ہوا، اور اس نے حجاز کوچ کرنے کا عزم کیا، اور حکومت کے معاملات اور شاہی تخت کو اس نے اپنے ولی عہد یعنی وارث تخت وتاج کے حوالے کیا، اور اپنے درباریوں کی ایک جماعت کے ساتھ مکہ وارد ہوا، اور چہرہ مبارک کی دید کا شرف حاصل کیا اور آپ ﷺ کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا اور وہاں چند دنوں رہے، پھر اپنے وطن واپس لوٹ گئے اور ان کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت تھی، جن میں: حبیب بن مالک، عبدالرحمٰن بن مالک، محمد بن مالک، اور دیگر حضرات شامل تھے، لیکن جب وہ یمن کے شہر ''ظفار'' پہنچے تو اللہ کو پیارے ہوگئے، اور وہاں دفن کئے گئے، اور موت سے پہلے اپنے ولی عہد حاکم مالابار کو لکھا کہ ان مسلمانوں کا پرجوش استقبال کریں اور ان کا احترام کریں اور انھیں ضروری مدد دیں اور سہولیات فراہم کریں، اور اپنے ملک میں انھیں اسلام کے پھیلانے کی اجازت دیں اور مسجدیں تعمیر کرنے کی منظوری دیں، (۶۲۹ عیسویں میں تعمیر شدہ چیرامن مسجد ہندوستان کی پہلی جامع مسجد ہے)(۶)۔

اور جب یمن پر کسریٰ کے گورنر باذان نے ۷ھ/ ۶۲۹ء میں اسلام قبول کیا تو اس کے لشکر نے بھی اسلام قبول کرلیا، اور اس میں میڈ اور جاٹ کی بڑی تعداد تھی (۷)، جاٹ قوم بعثت نبوی سے قبل ایران اور اس کے مضافات میں آباد تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں جب ایران پر اسلامی لشکر کی یلغار جاری تھی اور ایک شہر کے بعد دوسرا شہر اسلامی علم کے زیر نگیں آرہا تھا، تو ''اہواز'' کے علاقہ میں مسلمانوں کا مقابلہ جاٹوں سے ہوا(۸)۔

۱۶ھ ہجری میں ان کی بڑی تعداد نے ابوموسی اشعری کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور بصری میں آکر آباد ہوئے (۹)، ہندوستانی اقوام میں سے دوسری قوم جس سے مسلمانوں کا واسطہ پڑا وہ سندھی قوم تھی، حضرت عمر کے دور میں ۲۳ھ ہجری میں مکران فتح ہوا(۱۰)، پھر حضرت عثمانؓ کے دور میں فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھا، اموی دور میں ۹۳ ہجری تک سندھ محمد بن قاسم کے زیر نگیں آچکا تھا(۱۱)۔

چنانچہ اسلام پہلے پہل تاجروں کے ذریعہ ہندوستان میں داخل ہوا، مالابار کے ساحلی علاقہ پر قبل اسلام

سے ہی عرب تاجر آیا کرتے تھے ،ان ہی کی وجہ سے راجہ چیرامن پیرومل ؓ (تاج الدین) خدمت رسول میں حاضری دے کر مشرف باسلام ہوئے ، یہ ہند میں اسلام کی آمد کا اولین واقعہ ہے ، راجہ چیرامن پیرومل ؓ کا تعلق برصغیر کی چیرا سلطنت ، کیرالہ سے تھا، پھر نیک داعیوں اور ارباب سلوک وتصوف کی کوششوں سے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا ، اور وہ بڑے اولیاء جن کے اخلاق وعادات اور بہتر سلوک سے عام لوگ متأثر ہوئے ، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ شیخ اسماعیل لاہوری جو ۳۸۲ھ/۱۰۰۵ء میں لاہور آئے جہاں ہندو راجہ کی حکومت تھی ، اور ان کے ہاتھ پر بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا ، یہ اپنے وقت کے بڑے محدث بھی تھے ، ۴۴۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ پانچویں صدی ہجری کے ممتاز علماء اور محدثین میں ان کا شمار ہے ، بلکہ رحمان علی قادری کی صراحت کے مطابق وہ لاہور میں سب سے پہلے درس تفسیر دینے والے ہیں (۱۲)۔

۲۔شیخ صفی الدین کازرونی (م ۳۸۳ھ / ۱۰۰۷ء) نے ''اچھ'' کے علاقہ میں اسلامی دعوت کا کام انجام دیا (مرجع سابق)۔

۳۔علی بن عثمان ابوالحسن ھجویری (م ۴۶۵ھ)، جو گیارہویں صدی کے وسط میں لاہور آئے ، انہوں نے اسلام کی اشاعت میں بڑا رول ادا کیا (۱۳) تصوف میں ان کی کتاب ''کشف المحجوب'' مشہور ہے۔

۴۔سلطان سخی سرور کا نام سید احمد ہے ، لیکن یہ لکھ داتا سلطان سرور کے نام سے مشہور ہیں ، ان کی ولادت ملتان کے ایک موضع کرسی کوٹ میں ۵۲۴ھ/۳/اپریل ۱۱۳۰ء میں ہوئی ، یہ بچپن سے بڑے ذہین اور فہیم تھے ، اکثر اوقات اپنے والد مکرم سے شرعی مسائل سیکھتے رہتے تھے ، ان دنوں لاہور میں مولانا سید محمد اسحاق کے علم وفضل کا بڑا شہرا تھا ، آپ کو علوم ظاہری کے زیور سے آراستہ کرنے کیلئے لاہور بھیج دیا گیا ، مولانا کی محبت وتربیت وتعلیم کی بدولت آپ ان تمام صلاحیتوں اور صفات سے متصف ہوگئے جو کسی عالم دین کا خاصہ ہوتی ہیں ، تحصیل علم کے بعد واپس آکر باپ کا پیشہ اختیار کیا؛ لیکن زیادہ تر وقت یاد الٰہی میں بسر ہوتا تھا ، ظاہری علوم کے ہم آہنگ علوم باطنی حاصل کرنے کا جذبہ اشتیاق سینہ میں کروٹیں لینے لگا ، جس میں روز افزوں طغیانی آتی گئی ، آپ کے والد نے اگرچہ زراعت کے علاوہ بھیڑ بکریاں بھی پال رکھی تھیں ، لیکن ہر وقت یاد الٰہی میں مشغول رہتے تھے ، جب انہوں نے اس ہونہار بیٹے کا رجحان دیکھا تو اس طرح تربیت فرمانے لگے جیسے مرشد مرید کی تربیت کرتا ہے ، لیکن دل کی خلش برقرار رہی ، چاہتے تھے کہ سلوک ومعرفت کی راہوں پر گامزن ہوں ، علم لدنی سے مالا مال ہوں اور کسی صاحب حال بزرگ کے دست حق پرست پر بیعت ہوں۔

آپ نے سلسلہ چشتیہ میں خواجہ مودود چشتی ، سلسلہ سہروردیہ میں شیخ شہاب الدین سہروردی اور سلسلہ قادریہ میں شیخ عبدالقادر جیلانی سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ ۲۲/رجب المرجب ۵۷۷ھ/۱۱۸۱ء میں ۵۳/سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی ، ۱۲/ویں صدی کے وسط میں خطہ پنجاب میں آپ نے اسلام کی زبردست اشاعت کی (۱۴)۔

۵۔خواجہ معین الدین چشتی (۵۳۷ھ تا ۶۳۳) ، جنہوں نے شہر اجمیر کو ۵۹۰ھ/۱۱۹۲ء میں شرف بخشا ، ان کے برتاؤ اور اخلاق کو دیکھ کر بڑی تعداد نے اسلام کو قبول کیا (۱۵)۔

۶۔شیخ قطب الدین بختیار کعکی (۵۸۳ھ تا ۶۳۳ھ) نے بھی اسلام کی نشر واشاعت کے میدان میں بڑا کردار ادا کیا (۱۶)۔

۷۔شیخ نظام الدین دہلوی (۶۳۶ھ تا ۷۲۵ھ) کا بھی اسلام کی اشاعت میں بڑا حصہ ہے (۱۷)۔

۸۔شیخ نصیر الدین محمود بن یحی اُودھوی دہلوی (م ۷۵۷ھ) نے بھی اسلام کی نشر واشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا (۱۸)۔

۹۔شیخ احمد بن شہاب صدرالدین دہلوی (م ۹۵۷ھ) نے بھی دعوت اسلام کو عام کرنے میں بڑا حصہ لیا(۱۹)۔

۱۰۔شیخ زین الدین بن علی معبری ملیباری (۸۷۳ھ تا ۹۲۸ھ) نے بھی مالابار کے خطہ میں اسلام کی نشرواشاعت میں نمایاں حصہ لیا(۲۰)۔

خلاصہ کلام یہ کہ مغربی ساحلی علاقے مسلمانوں کو خوش آمدید کہنے میں پیش پیش تھے، اور یہاں کے بادشاہوں نے ان کے ساتھ بہتر سلوک کیااوران کے لئے ضروری سہولیات فراہم کیں، اورشمالی علاقے میں سندھ، اسلام سے سب سے پہلے آشنا ہو(۲۱)۔

حوالہ جات

۱۔حورانی، جورج فضلو(ولادت۱۹۱۳ء۔وفات۱۹۸۴ء)،العرب والملاحۃ فی المحیط الہندی، دارالکتاب العربی،۱۹۵۸ء،ص:۳۴۔

۲۔محمد بن سعد، الطبقات الکبری، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۰ء،ج:۱،ص:۲۵۶۔

۳۔بخاری، ابوعبداللہ،محمد بن اسماعیل (م۲۵۶ھ)،الجامع المسند الصحیح، ۵۴۶/۸،حدیث نمبر:۳۴۳۸، ط:۱، بیروت، دارطوق النجاۃ ،۱۴۲۲ھ، ع۔أ۔:۹، تحقیق:محمد زہیر بن ناصر۔

۴۔نسائی، احمد بن شعیب ابوعبدالرحمٰن (م۳۰۳ھ/۹۱۵ء)، المجتبی من السنن، حلب،مکتب المطبوعات الاسلامیہ،۴۲/۶، حدیث نمبر: ۳۱۷۵، ط: ۲، ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۶ء، تحقیق: ابوالفتاح ابوغدہ ،ع،أ: ۸، احمد بن محمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) ،مسندالامام احمد ،۸۱/۳۷،حدیث نمبر:۹۹۳۹۶،ط:۱، بیروت،مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۱ء، تحقیق:شعیب ارنؤوط اور دیگر،اور یہ حدیث صحیح۔

۵۔ابن حجر، ابوالفضل احمد بن حجر عسقلانی شافعی (م۸۵۲ھ/ ۱۴۴۹ء)، الاصابۃ فی تمییز الصحابہ،۴۳۴/۲۔۴۴۴، ط:۱، بیروت، العلمیہ،۱۴۱۵ھ۔

۶۔بیجاپوری، محمد بن قاسم بن غلام علی، تاریخ فرشتہ،۴۹۱/۲، ط: لکھنو،نول کشور،۱۲۲۱ھ۔

۷۔ابن حجر، الاصابہ،۴۶۴/۱، نیز ابن سعد،محمد بن سعد ابوعبداللہ ہاشمی (م ۲۳۰ھ/ ۸۴۵ء)، الطبقات الکبری، ۱۹۹/۱، ط:۱، بیروت،العلمیہ،۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء۔

۸۔بلاذری، ابوالحسن احمد بن یحی (پ:۸۰۶ء/و:۸۹۲ء)،فتوح البلدان، بیرت،مؤسسۃ المعارف،۱۹۸۷ء،ص:۵۳۱۔

۹۔مصدر سابق،ص:۵۲۔

۱۰۔طبری، ابوجعفر محمد بن جریر(پ:۸۳۹ء/و:۹۲۳ء)، تاریخ الطبری، داراحیاء التراث، بیروت، ۱۳۸۷ھ، ج:۴،ص:۱۸۱۔

۱۱۔ندوی،سید سلیمان (پ:۱۸۸۴ء/و:۱۹۵۳ء)،تاریخ سندھ، دارالاشاعت، کراچی،۱۹۹۵ء،ص:۸۷۔

۱۲۔رحمان علی، تذکرہ علماء ہند،ص:۱۱۱،لکھنؤ،نول کشور،۱۳۳۲ھ۔

۱۳۔بغدادی، اسماعیل باشا،ہدایت العارفین، ۶۹۱/۱، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ع۔أ۔:۲۔

۱۴۔شیخ محمد اکرم، آب کوثر،ص:۸۲۔۸۵، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ،۲۰۱۸ء۔

۱۵۔حسنی، عبدالحی (م۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء)،نزہۃ الخواطر، ۹۱/۱، ط: ۱، بیروت، دارابن حزم،۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء۔

۱۶۔مرجع سابق، ۱۱۴/۱۔

۱۷۔مصدر سابق، ۱۹۳/۲۔

۱۸۔مرجع سابق، ۲۰۹/۲۔

۱۹۔مصدر سابق، ۱۴۳/۲۔

۲۰۔مرجع سابق، ۳۴۱/۴۔

۲۱۔ندوی،سید سلیمان (پ:۱۸۸۴ء/و:۱۹۵۳ء)،تاریخ سندھ، دارالاشاعت، کراچی،۱۹۹۵ء،ص:۴۶۔

☆☆☆

❑ فلکیات

شہابِ ثاقب

ڈاکٹر محمد انس ندوی

آسمانوں سے پتھروں کی بارش نہ کوئی افسانہ ہے نہ دیومالائی کہانی، مگر ماہرین سائنس بہت عرصہ تک اس حقیقت سے انکار پر اڑے رہے، ارسطو نے 322 قبل مسیح شہاب ثاقب کے وجود کو تسلیم کرلیا تھا، مگر وہ اس کا قائل نہیں تھا کہ کوئی ٹھوس مادہ فضاء سے زمین پر گرسکتا ہے، یہ تصور اور نظریہ تقریباً ۱۷ویں صدی تک قائم رہا۔

اس دوران آسمان سے پتھر گرتے رہے، اور ان کے گرنے کی آواز دور دور تک سنائی دیتی رہی، لیکن اہل سائنس تاویلوں کا سہارا لے کر اس کا انکار کرتے رہے، ۱۸ویں صدی میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہوئی، 1790ء میں فرانس میں شہابی پتھروں کی ایسی بارش ہوئی کہ اس کے بارے میں 300 عینی شہادتیں گزریں، تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا اور 1830ء میں ماہرین نے یہ تسلیم کیا کہ ٹھوس مادہ زمین پر گرسکتا ہے، ہماری زمین حجر شہابی کی ہزاروں من راکھ سے بھری پڑی ہے، سب سے بڑا حجر شہابی مغربی نامبیا (West Nambia) واقع جنوبی افریقہ میں گرا جو ۶۶ شاٹ ٹن کا تھا، 1897ء میں مشہور ۳۴ شاٹ ٹن کا وزنی نکل اور لوہے کا بنا ہوا حجر شہابی نیویورک میں محفوظ ہے، 1905ء میں (۱۱۸) انچ لمبا اور 5.5 شارٹ ٹن وزنی حجر شہابی اوریگن امریکہ میں پایا گیا، 1908ء میں مشہور عالم ''تنگوسکا'' نامی حجر شہابی سائبریا میں گرا، جسے ۷ ہزار کلومیٹر ایریا میں رہنے والوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کی آواز کو ۸۰ کلومیٹر کی دوری تک سنا گیا۔

ماہرین سائنس نے ہڈسن بے (Hudson Bay) کناڈا کے ساحل پر ۵۴۰ کلومیٹر چوڑا شگاف دریافت کیا۔ خیال ہے کہ یہ وسیع وعریض شگاف حجر شہابی کا بنایا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ کناڈا میں مزید اب تک چار اور شگاف دریافت ہوئے ہیں، جو ۲ سے ۱۳ کلومیٹر چوڑے ہیں۔ جنوبی جزائر میں ۱۲۶۵ میٹر چوڑا اور ۱۷۴ میٹر گہرا شگاف پایا گیا، اریزونا (Arizona) امریکہ میں ۱۲۶ میٹر چوڑا اور ۱۷۴ میٹر گہرا شگاف دریافت ہو۔ ان سب شگافوں کے ایک ہی سبب حجر شہابی کے زمین پر گرنے پر ماہرین سائنس متفق ہیں۔ یہ تمام ہی احجار شہابی کسی نہ کسی ستارے سے ٹوٹ کر گرے ہیں، یہ دو طرح کے ہوتے ہیں حجری و فولادی، حجری ٹکڑے پتھریلے مادوں سے بنے ہوتے ہیں اور بعض میں آتش فشانی مادہ بھی ہوتا ہے، فولادی ٹکڑے لوہے اور نکل کی آمیزش سے بنتے ہیں، گرتے ہوئے ستارے کبھی کبھی دنیا میں چمکتی ہوئی لکیر کے مانند دکھائی دیتے ہیں مگر زیادہ تر ایسے ہیں جو زمین تک پہنچتے پہنچتے گرد ہوجاتے ہیں اور ہمیں دکھائی نہیں دیتے، لیکن بعض

ٹکڑے زمین پر گر کر شگاف پیدا کر دیتے ہیں، اور اہل دنیا کے لئے کثیر نقصانات کا باعث بنتے ہیں ایسا ہی ایک گہرا شگاف سعودی عرب کے مقام خرج (جو ریاض سے ملا ہوا ہے) میں موجود ہے۔ The world Book of (Encyclopedia Vol.13)

شہابی پتھروں یا ستاروں کا ذکر قرآن نے کیا ہے اور اس کے نیچے گرنے کا سبب بیان کیا ہے، اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے ﴿إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنيَا بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ، وَ حِفْظاً مِّنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ ، لَايَسَّمَّعُوْنَ إِلَى الْمَلَإِ الاَعْلَى وَ يَقْذِفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ، دُحُوْراً وَ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ، إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴾(الصافات/۷۔۱۰) ''ہم نے آسمان دنیا کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے اور اسے ہر شیطان سرکش سے محفوظ کر دیا ہے، یہ شیاطین ملأ اعلی کی باتیں نہیں سن سکتے، ہر طرف سے بھگائے جاتے ہیں اور ان کے لئے پیہم عذاب ہے، تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اُڑے، تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے''۔

یعنی عالم بالا محض خلا ہی نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اس میں نفوذ کر جائے، بلکہ اس کی ایسی مضبوط بندش کی گئی ہے اور اس کے خطے ایسے مستحکم سرحدوں سے محصور کئے گئے ہیں کہ کسی شیطان سرکش کا ان حدوں سے گزر جانا ممکن نہیں ہے، کائنات کے تاروں اور ہر سیارے کا اپنا ایک دائرہ ہے جس کے اندر سے کسی کا نکلنا بھی سخت دشوار ہے اور باہر سے اس کے اندر کسی کا داخل ہونا بھی آسان نہیں ہے، اس کا اندازہ ان دشواریوں سے کیا جا سکتا ہے جو انسان کو اپنی دنیا کے سب سے قریبی ہمسایہ چاند پر قدم جمانے میں پیش آ رہی ہیں، ایسی ہی مشکلات زمین کی دوسری مخلوق یعنی شیاطین وجن کے لئے بھی عالم بالا میں صعود کرنے میں پیش آتی ہیں، گویا عالم بالا کا نظام شیاطین کی دراندازی سے محفوظ ہے، اور اگر شیاطین وہاں کی باتیں سننے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کا تعاقب ایک تیز شعلہ کرتا ہے۔

دوسری جگہ اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے :﴿وَ حَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ، إِلَّا مَنْ اِسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ﴾(الحجر/ ۱۷۔۱۸) ''ہم نے آسمان کو ہر مردود شیطان سے محفوظ کر دیا ہے، مگر جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرے اس کے پیچھے ایک دہکتا ہوا شعلہ لپکتا ہے''

رجیم مرجوم کے معنی میں ہے، یعنی سنگسار کیا ہوا، شیطان کو رجیم اس لئے کہتے ہیں کہ جب وہ آسمان کی طرف جانے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر آسمان سے شہاب ثاقب ٹوٹ کر گرتے ہیں، رجیم ملعون و مردود کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، کیونکہ جسے سنگسار کیا جاتا ہے اسے لعنت ملامت بھی کی جاتی ہے، یہ شیاطین شہاب ثاقب کے گرنے سے جل مرجاتے ہیں اور کچھ بچ جاتے ہیں اور بعض ملأ اعلی کی کچھ سن گن لے آتے ہیں۔ حدیث میں اس کی تفسیر اس طرح آتی ہے:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں'' جب اللہ تعالی آسمان پر کوئی فیصلہ فرماتا ہے تو فرشتے اسے سن کر اپنے پر یا بازو پھڑ پھڑاتے ہیں (عجز ومسکنت کے طور پر) گویا وہ کسی چٹان پر زنجیر کی آواز ہے، پھر جب فرشتوں کے دلوں سے اللہ کا خوف کم ہوتا ہے تو وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں اس نے جو کہا حق کہا، اور وہ بلند اور بڑا ہے، (اس کے بعد فیصلہ اوپر سے نیچے تک یکے بعد دیگرے سنایا جاتا ہے) اس موقعے پر شیطان چوری چھپے بات سنتے ہیں، اور چوری چھپے بات سننے والے شیطان تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں، اور وہ ایک آدھ کلمہ سن کر اپنے دوست نجومی یا کاہن کے کان میں پھونک دیتے ہیں، وہ اس کے ساتھ سو جھوٹ ملا کر لوگوں کو بیان کرتا ہے۔ (صحیح البخاری، کتاب التفسیر/سورۃ الحجر)

سورہ جن میں جناتوں کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم سے قرآن سننے کو بیان کیا گیا ہے، جنوں کا کہنا ہے کہ ان لوگوں نے بعثتِ نبوی کے وقت عالم بالا میں ایک خاص ہماہمی اور سخت انتظامات کو محسوس کیا، اور بیان کیا ہم میں سے کوئی سن گن لینے کی جرأت کرتا تو ستاروں کے ذریعے مار بھگایا جاتا ﴿ وَ أَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْنَاهَا مُلِئَتْ حَرَساً شَدِيداً وَّ شُهُباً، وَّ أَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ، فَمَنْ يَّسْتَمِعُ الْآنَ يَجِدْ لَهُ شِهَابا رصدا﴾" کہ ہم پہلے سن گن لینے کے لئے آسمان میں بیٹھنے کی جگہ پالیتے تھے، مگر اب جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے لئے گھات میں شہاب ثاقب لگا ہوا پاتا ہے" اس سے مشرکین عرب کے اس خیال کی تردید کی گئی کہ جن غیب کا علم رکھتے ہیں، یا خدائی اسرار تک انہیں رسائی حاصل ہے۔

الحجر، الملک اور الجن تینوں سورتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ جن وشیاطین اگرچہ عالم بالا کی طرف پرواز کر سکتے ہیں، مگر ایک حد سے آگے نہیں جاسکتے، اس سے اوپر جانے کی کوشش کریں اور ملاء اعلی کی باتیں سننا چاہیں تو انہیں روک دیا جاتا ہے، چوری چھپے سن گن لیں تو شہاب ثاقب ان کو مار بھگاتے ہیں، شیاطین وجن کیا ہیں اور اسلام کا ان کے بارے میں کیا نظریہ ہے؟ اس کی وضاحت قرآن وحدیث سے ہم کو ملتی ہے۔ جن یا ابلیس وشیطان انسان سے الگ دوسری نوع کی پوشیدہ مخلوق ہیں وہ اپنا ایک مستقل خارجی وجود رکھتے ہیں، ان کی تخلیق انسان سے قبل ہوئی ہے، ان کی پراسرار صفات کی وجہ سے جاہل لوگوں نے انکے بارے میں بڑے مبالغہ آمیز تصور قائم کر رکھے ہیں، حتی کہ ان کی پرستش تک کرڈالی گئی، مگر قرآن نے ان کی اصل حقیقت پوری طرح واضح کردی ہے، قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جن انسان کی طرح ایک بااختیار مخلوق ہے اور اس کو طاعت ومعصیت اور کفر وایمان کا ویسا ہی اختیار دیا گیا جیسا انسان کو دیا گیا ہے، قرآن میں متعدد مقام پر یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ابلیس نے تخلیق آدم کے وقت ہی یہ عزم کرلیا تھا کہ وہ نوع انسانی کو گمراہ کرنے کی کوشش کریگا، اور اسی وقت سے شیاطین جن انسان کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں، مگر ان پر مسلط ہوکر زبردستی کوئی کام کرالینے کی طاقت نہیں رکھتے، بلکہ اس کے دل میں وسوسے ڈالتے ہیں، اس کو بہکاتے ہیں اور بدی وگمراہی کو اس کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کرتے ہیں۔

"موجودہ زمانے کے بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جن کسی حقیقی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ یہ بھی پرانے زمانے کے اوہام وخرافات میں سے ایک بے بنیاد خیال ہے، یہ رائے انہوں نے کچھ اس بنا پر قائم نہیں کی ہے کہ کائنات کی ساری حقیقتوں کو وہ جان چکے ہیں اور انہیں یہ معلوم ہوگیا ہے کہ جن کہیں موجود نہیں ہیں۔ ایسے علم کا دعوی وہ خود بھی نہیں کرسکتے، مگر انہوں نے بلادلیل یہ فرض کرلیا ہے کہ کائنات میں بس وہی کچھ موجود ہے جو ان کو محسوس ہوتا ہے، حالانکہ انسان کے محسوسات کا دائرہ اس عظیم کائنات کی وسعت کے مقابلہ میں وہ نسبت بھی نہیں رکھتا جو سمندر کے مقابلے میں قطرے کی نسبت ہے، یہاں جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ محسوس نہیں ہے وہ موجود نہیں ہے، اور جو موجود ہے اسے لازما محسوس ہونا چاہئے، دراصل وہ خود اپنے ذہن کی تنگی کا ثبوت دیتا ہے، یہ طرزِ فکر اختیار کرلیا جائے تو ایک جن ہی کیا انسان کسی ایسی حقیقت کو بھی نہیں مان سکتا جو براہِ راست اس کے تجربے اور مشاہدے میں نہ آتی ہو اور اس کے لئے خدا تک کا وجود قابل تسلیم نہیں ہے کجا کہ وہ کسی اور غیر محسوس حقیقت کو تسلیم کرے" (تفہیم القرآن، سورۃ الجن، مولانا مودودیؒ)

☆☆☆

❑ علم و تحقیق

سیرت طیبہ کے مشہور من گھڑت واقعات

محمد سہیل ندوی

(مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ)

قرآن کریم ایک واضح اور روشن کتاب ہے، اس میں کسی طرح کا ابہام وغموض نہیں ہے؛ لیکن اس میں تعلیمات شرعی کی تفصیلات اور جزئیات نہیں بیان کی گئیں ہیں، اجمالی طور پر قرآن کریم احکامات شرعیہ کو بیان کرتا ہے۔ ان کی تفسیر وتوضیح احادیث نبویہ سے کی جاتی ہے، قرآن کریم وحی الٰہی کے ذریعہ آپ ﷺ کے قلب اطہر پر نازل کیا گیا اور اس بات کا حکم دیا گیا کہ اس کو پوری دنیا میں عام فرمادیں، آپ ﷺ کا کام محض کلام الٰہی کو لوگوں تک پہنچا دینا نہیں تھا بلکہ اس کی وضاحت اور تبیین و تشریح کی ذمہ داری بھی آپ ﷺ کے سپرد کی گئی ہے، ارشاد ربانی ہے کہ ''ہم نے تمہارے پاس نصیحت نامہ بھیجا ہے کہ لوگوں کو صاف کھول کر بتادو کہ ان کی طرف کیا اتارا گیا ہے تاکہ وہ غور وفکر سے کام لیں'' (نحل ۴۴)۔ اور یہ تبیین وتشریح آپ اپنے مَن سے نہیں بلکہ وحی الٰہی کی روشنی میں فرماتے تھے، آپ اپنی خواہشات سے نہیں بولتے تھے، گویا آپ ﷺ جس چیز کا حکم بھی دیتے اور جو بات بھی شارع کی حیثیت سے فرماتے وہ دین کا اٹوٹ حصہ ہوتی، اسی لئے جابجا قرآن کریم میں یہ بات ارشاد فرمائی گئی ہے کہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول ﷺ کی اتباع بھی لازم ہے، اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ قرآن وحدیث دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں، لازم وملزوم ہیں، کسی ایک کو دوسرے سے جدا کرکے اسلام کا صحیح فہم حاصل نہیں کیا جاسکتا، قرآن اجمال ہے، احادیث مبارکہ اور سیرت کے واقعات اس کی تفسیر ہیں۔

اس سے معلوم یہ ہوا کہ اللہ کے رسول ﷺ کے تمام اقوال واعمال انسانی برادری کی فلاح وکامیابی لئے واجب العمل اور ضروری ہیں، جو درجہ قرآن کریم کے اوامر ونواہی کو حاصل ہے وہی درجہ آپ ﷺ کے اقوال وافعال کا بھی ہے۔

اسی طرح سیرت کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ وہ قرآن پاک کی تفسیر بھی ہے اور اس کے اجمال کی تفصیل بھی، اس کے احکام کی جزئیات کی تشریح بھی اور عہد نبوی کی منظر کشی بھی، اس کے بغیر اسلامی تاریخ کے بہت سے صفحات سادہ اور کورے رہ جائیں گے۔ اس بات میں کوئی تردد نہیں ہے کہ ایمان وعقائد، عبادات ومعاملات، اخلاق ومعاشرت، سیاست ومعیشت کا دارومدار آپ ﷺ کی سیرت طیبہ اور احادیث مبارکہ پر ہے، اور آپ ﷺ کی سیرت کو اور آپ ﷺ کے اخلاق وکردار کو اسلام میں وہی مقام حاصل ہے جو ریڑھ کی ہڈی کو جسم میں حاصل ہے۔ اس لیے ہر وہ بات جو معاشرہ میں چلائی جارہی ہو اور اس کی نسبت آپ ﷺ کی طرف کی جارہی ہو اس کی تحقیق وتفتیش کے بغیر اس پر عمل کرنا یا اس کو دین کا حصہ سمجھنے لگنا خطرہ سے خالی نہیں ہے، دشمنان اسلام کی جانب سے بارہا سازشیں کی گئیں اور اسلام کی شبیہ کو داغ دار بنانے کے لئے احادیث گھڑی گئیں، من گھڑت واقعات وروایات کو آپ ﷺ کی جانب

منسوب کیا گیا۔ ہر مسلمان کو اپنی روشن تعلیمات سے درست واقفیت اور صحیح معلومات حاصل کرنے کے لئے ان تمام سازشوں کا ادراک ضروری ہے۔

سیرت میں بہت سے واقعات ایسے ہیں جن کی کوئی سند نہیں، احادیث کی کتابوں میں کہیں اس کا تذکرہ نہیں، لیکن پھر بھی وہ واقعات ہر خاص و عام کے زبان زد ہیں اور ان کو کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے، ضرورت ہے ان کی تحقیق کی جائے اور حقائق کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا جائے، سیرت طیبہ اور سیرت کی معتبر و مستند کتابوں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تا کہ اسلامی تاریخ میں کسی قسم کا رطب و یابس جمع نہ ہو سکے، محدثین اور اسماء رجال کے ماہرین کے یہاں یہ مسلّمہ اصول ہے کہ ہر وہ واقعہ جس کی احادیث کی کتابوں میں کوئی سند نہ ہو وہ قابل قبول نہیں اگر چہ وہ اپنے معنیٰ و مفہوم کے لحاظ سے درست ہی کیوں نہ ہو۔

ان ہی چند واقعات میں ایک واقعہ یہ ہے ''کہ آپ ﷺ عید کے دن نماز کے لئے نکلے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ سب بچے نئی نئی پوشاکوں میں ملبوس خوش و خرم عید کی خوشیاں منا رہے ہیں لیکن ان میں ایک بچہ ایسا بھی ہے جو بہت بوسیدہ کپڑوں میں الگ افسردہ بیٹھا ہے، حضور پاک ﷺ اس بچہ کے پاس تشریف لے جاتے ہیں اور اس کا حال معلوم کرتے ہیں، پوچھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ یتیم ہے اور اس کی کفالت کرنے والا کوئی موجود نہیں ہے، آپ ﷺ اس کو گود میں اٹھاتے ہیں اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہیں اور گھر لے جا کر حضرت عائشہؓ سے کہتے ہیں کہ اس بچہ کو نہلا دھلا کر عمدہ کپڑے پہناؤ''۔ اس واقعہ کا تذکرہ نہ حدیث کی کسی مشہور و معروف کتاب میں ہے اور نہ ہی کسی معتبر سیرت نگار نے اس کو لکھا ہے۔

اسی طرح ایک واقعہ یہ بہت کثرت سے بیان کیا جاتا ہے ''کہ حضور پاک ﷺ کے اوپر ایک بڑھیا روزانہ کوڑا کرکٹ پھینکتی تھی مگر چند دن ایسے گزرے کہ آپ ﷺ کے اوپر کوڑا کرکٹ نہیں پھینکا گیا، آپ ﷺ کو اس کی فکر ہوگئی اور معلوم یہ ہوا کہ وہ بڑھیا بیمار ہوگئی ہے، آپ ﷺ فوراً اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، وہ آپ ﷺ کے کریمانہ اخلاق کو دیکھ کر مسلمان ہوگئی'' اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ آپ ﷺ رحمۃ للعالمین تھے، تمام انسانوں کے محسن اور خیر خواہ تھے، اعلیٰ اخلاق و صفات کے حامل تھے، اور آپ کے بلند اخلاق اور کریمانہ صفات کی بڑی بڑی مثالیں سیرت کے ذخیرہ میں موجود ہیں؛ لیکن مقصود یہ ہے کہ من گھڑت واقعات وہ چاہے کیسے بھی ہوں سیرت کا حصہ سمجھ کر ان کا مطالعہ نہ کیا جائے، اور عوام کے سامنے اس طرح کے واقعات بیان کرنے سے گریز کرنا ہماری ایمانی و اخلاقی ذمہ داری ہونا چاہیے، بالخصوص ارباب مدارس و اسکول کے ذمہ داران کو اس کے لئے سنجیدہ اور فکر مند ہونا چاہیے کیونکہ یہ بات مشاہدہ میں آتی ہے کہ پرائمری و ابتدائی درجات کے چھوٹے بچوں کے لئے عام طور سے سیرت کی بنیادی کتابیں جو اسکولوں اور مدرسوں میں نصاب کے طور پر پڑھائی جاتی ہیں ان میں اس طرح کے واقعات کثرت سے ملتے ہیں اور وہیں سے وہ نوک زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اس طرح کی کتابوں پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے تا کہ ان کے ذریعہ سے بے بنیاد اور غلط واقعات کی تشہیر نہ ہو سکے۔

اس طرح کے واقعات کی ایک طویل فہرست ہے جو مشہور ہوگئے ہیں اور بہت سے اہل علم بھی جن کی شہرت سے دھوکہ کھا گئے اور ان کو بیان کرنے اور سننے لگے ہیں۔ ضروری ہے کہ سیرت کے ذخیرے کو ایسے من گھڑت واقعات سے پاک کیا جائے۔ ہم موقع بہ موقع ایسے مشہور و من گھڑت واقعات سے قارئین کو واقف کراتے رہیں گے اِن شاء اللہ۔

☆☆☆